فلسفۂ شہادت



فلسفۂ شہادت

استاد مرتضیٰ مطہری شہیدؒ

جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان
پوسٹ بکس نمبر ۵۴۲۵ ۔ کراچی

ترجمہ کتاب شہید

تالیف ---------------------- استاد مرتضیٰ مطہری

ترجمہ ---------------------- محمد فضل حق مرحوم

نظر ثانی ---------------------- رضا حسین رضوانی

کتابت ---------------------- سید جعفر صادق

طبع پنجم ---------------------- ۲۰۰۶ء ۱۴۲۷ھ

مطبع ---------------------- مقصود [illegible] کراچی

فہرست

دیباچہ

فانی انسان کی ہمیشہ یہ شدید آرزو رہی ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں جاودانی زندگی سے ہمکنار ہو جائے اور ہر مذہب و مسلک نے یہ پاکیزہ مقصد حاصل کرنے کے لیے مختلف ذرائع تلاش کیے ہیں۔ رہبانیت اور سنیاس انھیں کوششوں کا ایک حصہ ہیں۔ تاہم اِس مسئلے کا سب سے سادہ، آسان اور قابلِ فہم حل پیش کرنے کا اعزاز فقط اسلام کو حاصل ہے۔ وہ حل "شہادت" ہے۔

اسلام میں حیاتِ جاوید کا تصور "شہید" کے پیکر میں سمو دیا گیا ہے اور اس لفظ کے ساتھ ایک خاص عظمت، جاہ و جلال اور تقدس وابستہ ہے۔

"شہید" کی اپنی ایک خاص شان ہے۔ وہ اپنی عزیز ترین متاع یعنی زندگی کا نذرانہ دے کر مذہب و ملت کی بقا کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اُس کا خون قوم کی رگوں میں دوڑ کر اسے حیاتِ نو بخشتا ہے۔ یہ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کی تائید تاریخِ انسانیت قدم قدم پر کرتی ہے۔

یوں تو دنیا کی ہر قوم اپنے شہیدوں پر فخر کرتی ہے لیکن اسلام میں "شہید" اور "شہادت" کا تصور سب سے ارفع اور بلند ہے۔ شہید راہِ حق کا وہ سپاہی ہے جو اسلام کی حفاظت اور سربلندی کی خاطر اپنی زندگی کے آخری لمحے تک لڑتا ہے اور شہادت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ وہ جیتا ہے تو اسلام کی خدمت کی خاطر جیتا ہے اور جب مرتا ہے تب بھی اس کا مقصد اسلام کی خدمت ہی ہوتا ہے۔ شہادت وہ عالی ترین رتبہ ہے جس کی آرزو ایک مسلمان کر سکتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اسے عام انسانوں سے الگ کر کے حیاتِ جاوید بخشتی ہے۔ یہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔

علامہ مرتضیٰ مطہری نے جو اب خود بھی رتبۂ شہادت پر فائز ہو چکے ہیں اس کتاب میں اپنے مخصوص انداز میں فلسفۂ شہادت پر روشنی ڈالی ہے اور اسلام کے نقطۂ نگاہ سے شہادت کی شرائط اور شہید کے کردار اور مقام کی بھرپور وضاحت کی ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کے دل میں وہ حقیقی جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے جو مذہب و ملت کے تحفظ کی ضمانت ہے۔

اس کتاب میں شعارِ اسلام کے عنوان سے ایک ضمیمہ بھی شامل ہے۔ شعار سے مراد وہ اشعار یا نثر میں ادا کیے گئے وہ اقوال ہیں جو جنگجو میدانِ جنگ میں اترتے وقت اپنا یا اپنے نصب العین کا تعارف کرانے کے لیے پڑھتے تھے جیسا کہ اس مضمون میں واضح کیا گیا ہے امام حسینؑ نے عاشورا کے دن کئی اسلامی شعار دیے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم نے سانحۂ کربلا کے سلسلے میں وہ شعار بھلا کر کئی نئے شعار اپنا لیے ہیں جو کسی طور بھی حسینی تحریک سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ہمارا فرض ہے کہ آج ہم ایک دفعہ پھر حسینی شعار اپنا کر اپنے ایمان کو جلا بخشیں۔

بسم رب الشہداء

دنیا کے تمام لوگوں کی زبان میں خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان اور بالخصوص مسلمانوں کی زبان میں کچھ ایسے الفاظ ملتے ہیں جن میں فقط عزت و عظمت کا ہی نہیں بلکہ اکثر تقدس کا مفہوم بھی سمویا ہوا ہوتا ہے۔ طالب علم، استاد، عالم، فلسفی، موٗحد، سورما، مصلح، مجتہد، مومن، عابد، زاہد، مجاہد، مہاجر، صدیق، ولی، امام، نبی اور رسول چند ایسے الفاظ ہیں جن میں عزتِ عام میں اور چند ایک میں مسلمانوں کے عرفِ خاص میں عزت و احترام اور بعض اوقات تقدس بھی جھلکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک لفظ میں محض لفظ کی حیثیت سے کوئی تقدُّس نہیں ہوتا ہے۔ یہ تقدس فقط اُس مفہوم کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جو اس میں مضمر ہوتا ہے۔ بعض معانی و مفاہیم کا تقدس کم و بیش فرق کے ساتھ تمام انسانی معاشروں میں موجود ہے یہ فرق غیر مادی امور کی قدر و قیمت کے سلسلے میں معاشروں کی نفسیات کی خاص کیفیت سے مربوط ہوتا ہے۔

اسلام میں ایک ایسا لفظ ہے جو خاص تقدس کا حامل ہے۔ اگر کوئی شخص

اسلامی مفاہیم سے واقف ہو اور اس لفظ کے معنی خاص اسلامی طریقہ استعمال کے مطابق کرے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس لفظ کے اردگرد نور کا ایک ہالہ چھایا ہوا ہے۔ وہ لفظ شہید ہے۔ یہ لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہو اس میں تقدس اور بڑائی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے فطری طور پر دل میں جاہ و جلال اور تقدس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ہم فقط اس لفظ کے اسلامی مفہوم سے بحث کریں گے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق وہی شخص شہید کا رتبہ حاصل کرتا ہے جس کی شہادت اسلام کے مقرر کردہ معیارات کے مطابق انجام پائے یعنی شہادت کا اعزاز اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو بلند ترین اسلامی مقاصد کے حصول کی کوشش کرتے ہوئے قتل ہو جائے اور یہ عظیم قربانی پیش کرنے سے اس کا مقصد صحیح انسانی اقدار کی حفاظت کرنا ہو۔

اسلامی فلسفے میں شہید کا رتبہ ان ممکنہ بلند مراتب میں سب سے بڑا رتبہ ہے جسے اگر ایک انسان ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے حاصل کرنے کی کوشش کرے تو حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث میں شہداء کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے اس لفظ کے صحیح مفہوم کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ مسلمان اسے کیوں اس قدر محترم اور مقدس سمجھتے ہیں۔ مختصر سی کوشش سے اس لفظ کا صحیح مفہوم سمجھ میں آ جائے گا اور یہ بھی پتا چل جائے گا کہ شہادت کے حصول کے لیے کون سے اعلیٰ مدارج طے کرنے پڑتے ہیں۔

شہید نزدِ خدا

قرآنِ مجید شہید کے حق سے پیوستگی کے سلسلے میں فرماتا ہے :

" وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ "

(سورۃ آلِ عمران ۔ آیت ۱۶۹)

اور تم گمان بھی نہ کرو کہ کشتگانِ راہِ خدا مُردہ ہیں۔ نہیں، وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں "

اسلام میں جب کسی قابلِ تعریف رُتبے یا فعل کو سراہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو شہید کا رُتبہ حاصل ہے یا یہ کہ فلاں فعل اس قابل ہے کہ اس کے لیے شہادت کا اجر دیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی طالبِ علم حق کی تلاش اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر علم حاصل کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ حصولِ علم کی کوششوں کے دوران مرگیا تو شہید کی موت مرے گا۔ یہ الفاظ ایک طالبِ علم کے بلند رُتبے اور مقدس مقام کی عکاسی کرتے ہیں۔

اسلام کاہلی اور دوسروں پر بار بننے کا سخت مخالف ہے اور محنت سے کام کرنے کو انسان کا فریضہ قرار دیتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں فرمایا گیا :

" اَلْكَادُّ لِعِيَالِهٖ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "

" جو شخص اپنا اور اپنے اہلِ خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے محنت کرتا ہے اور خود زحمت اُٹھاتا ہے تو وہ ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہو "

تمام وہ اشخاص جنہوں نے کسی طرح بھی انسانیت کی خدمت کی ہے خواہ

وہ علماء ہوں، فلاسفہ ہوں، اساتذہ ہوں یا موجدین، محققین اور مفکرین۔ اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ بنی نوعِ انسان اُن کے شکرگزار ہوں تاہم یہ حق جتنا شہداء کو پہنچتا ہے اور کسی کو نہیں پہنچتا اور یہی وجہ ہے کہ ہر طبقے کے لوگ اُن سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کے تمام دوسرے محسن شہداء کے احسان مند ہیں لیکن شہداء ان میں سے کسی کے بھی زیرِ بارِ احسان نہیں۔ اپنی اپنی خدمات انجام دینے کے لیے عالموں، فلسفیوں، موجدوں اور استادوں وغیرہ کو خوشگوار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ شہداء ہی ہیں جو عظیم ترین قربانی دے کر انھیں یہ ماحول مہیّا کرتے ہیں۔

شہید کی مثال ایک شمع کی سی ہے جس کا کام دوسروں کو روشنی مہیّا کرنے کی خاطر جلنا اور پھر بجھ جانا ہے۔ شہداء عالمِ انسانیت کی شمعیں ہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کو روشنی مہیّا کرنے کے لیے اپنے آپ کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی روشنی نہ پھیلائیں تو کوئی انسانی معاشرہ نہ تو اپنے کام کا آغاز کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے جاری رکھ سکتا ہے۔

ایک شخص جو دن کے وقت سورج کی روشنی میں اور رات کے وقت چراغ یا شمع کی روشنی میں کام کرتا ہے اُس کی نگاہ ہر چیز پر ہوتی ہے لیکن اُس کا خیال روشنی کے ماخذ کی طرف نہیں جاتا حالانکہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ روشنی کے بغیر وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا۔ شہداء انسانیت کو فروغ بخشتے ہیں۔ اگر وہ اپنی روشنی جہالت، ظلم و استبداد اور غلامی کے اندھیروں پر نہ ڈالتے تو عالمِ انسانیت کے لیے کوئی ترقی کرنا ممکن نہ ہوتا۔

قرآنِ مجید نے رسولِ اکرمؐ کو ایک بڑے لطیف لفظ سے تعبیر کیا ہے اُس نے انھیں "سراجِ منیر" یعنی نور پھیلانے والا چراغ کہا ہے۔ اس لفظ میں جلنے

اور روشنی پھیلانے کے دونوں مفاہیم جمع ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَ
نَذِيرًا ۝ وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِإِذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا ۝

(سورۃ الاحزاب، آیات ۴۵، ۴۶)

"اے نبی! بلاشبہ ہم نے تمھیں گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف اُسی کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

مولانا روم، آیۂ کریمہ "يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝" کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خواند مزمل نبی را زین سبب
کہ برون آی از گلیم ای بوالہرب
ہمین قم اللیل کہ شمعی ای ہمام
شمع، دائم شب بود اندر قیام

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسلامی اصطلاحات کے مطابق "شہید" ایک مقدس لفظ ہے اور جو لوگ اسلامی ذخیرۂ الفاظ استعمال کرتے ہیں انھیں ہر دوسرے لفظ کے مقابلے میں بلند تر مفہوم کا پتا دیتا ہے۔

شہید کا بدن

اسلام ایک حکیمانہ دین ہے جس کے قوانین، خصوصاً اجتماعی قوانین مصلحت رموز اور اسرار سے خالی نہیں ہیں۔ اسلامی قانون کے مطابق ہر مسلمان میت کو مقررہ طریقے

کے مطابق غسل دینا اور پاک وصاف کپڑے کا کفن پہنانا ضروری ہے۔ اس کے بعد نماز جنازہ ادا کرکے اُسے دفن کر دینا چاہیئے۔ یہ تمام اعمال حکمت اور رموز سے خالی نہیں ہیں۔ لیکن بالفعل ان کے بارے میں بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔

اس کے مقابلے میں اس عام قاعدے کی ایک استثناء بھی ہے۔ شہید پر نماز میّت اور دفن کے احکام کا اطلاق تو ہوتا ہے لیکن اسے غسل دینے یا تازہ کپڑوں کا کفن پہنانے کی کوئی ضرورت نہیں اُسے اُنہی کپڑوں میں دفن کر دینا چاہیے جو وہ شہادت کے وقت پہنے ہوئے ہو۔

اس استثناء میں ایک راز اور رمز پوشیدہ ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ شہید کی ذات اور اس کی شخصیت اس قدر مکمل طور پر پاک صاف ہو چکی ہوتی ہے کہ یہ طہارت اس کے بدن، خون حتیٰ کہ لباس تک پر اثر ڈالتی ہے۔ شہید کا بدن "متروح" ہوتا ہے یعنی اس پر روح کے احکام جاری ہوتے ہیں اور پھر جو احکام اس کے بدن پر جاری ہوتے ہیں وہی اس کے لباس پر جاری ہوتے ہیں۔ شہید کا بدن اس کی روح، اندازِ فکر، حق پرستی اور پاکیزگی کے سبب عزت و شرف حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر وہ میدانِ کارزار میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دے تو اسے خون آلود بدن اور لباس کے ساتھ بغیر غسل دیے دفن کر دیا جاتا ہے۔ شہید کے بدن کے متعلق فقہ اسلامی میں یہ خاص حکم اس کے تقدس کا پتا دیتے ہیں۔

شہید کا تقدس

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شہادت کو ایک مقدس چیز سمجھنے کی وجہ کیا ہے؟ یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ محض قتل ہو جانا تقدس کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

موت ہمیشہ مایۂ افتخار نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو ذلت کا موجب ہوتی ہے۔

بہتر ہوگا کہ اس نکتے کی مزید وضاحت کی جائے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں موت کی کئی قسمیں ہیں جنھیں مندرجہ ذیل طبقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

ا۔ طبعی موت

اگر کوئی شخص حسبِ معمول زندگی گزار کر طبعی موت مرجائے تو اسے ایک معمولی واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی ایسی چیز ہے جس پر فخر کیا جائے اور نہ ہی باعثِ ملامت ہے۔ ایسی موت کوئی خاص رنجیدہ واقعہ خیال کی جاتی ہے اور نہ ہی ایسی موت کو 'ضائع' ہونا کہا جاسکتا ہے۔

ب۔ حادثاتی موت

جو موت کسی حادثے یا وبائی بیماری مثلاً چیچک یا طاعون کی وجہ سے واقع ہوئی ہو یا قدرتی آفات مثلاً زلزلے یا سیلاب کا نتیجہ ہو اسے اگرچہ باعثِ فخر یا باعثِ ملامت نہیں سمجھا جاتا لیکن یہ جان کا 'ضائع' ہونا ہے اور قہراً قابلِ افسوس ہوتا ہے۔

ج۔ جُرم کے نتیجے میں موت

یہ صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب ایک شخص ہوا و ہوس کی بنا پر یا دوسرے کو اپنا حریف اور مدِمقابل سمجھتے ہوئے اُسے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے۔ قتل کی ایسی وارداتوں کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ ہم اکثر اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ مثلاً ایک عورت نے اپنے نو عمر سوتیلے بیٹے کو اس لیے قتل کر دیا کہ اُس کا باپ

اُسے بہت چاہتا تھا جبکہ وہ چاہتی تھی کہ اُس کا خاوند فقط اُسی کو چاہے اور کوئی دوسرا اس محبت میں دخیل نہ ہو یا یہ کہ ایک آدمی نے ایک عورت کو اس لیے مار ڈالا کہ اُس نے اس کے پیامِ محبت کا جواب سرد مہری سے دیا تھا۔ اسی طرح ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ ایک حاکم نے اپنے حریف کے سارے خاندان کو تہ تیغ کر دیا تاکہ مخالفین میں سے تخت و تاج کا کوئی دعویدار باقی نہ رہے۔

ایسے حالات میں قاتل کا فعل انتہائی ظالمانہ اور نفرت انگیز سمجھا جاتا ہے اور مقتول کو کشتہ جور و جفا قرار دیا جاتا ہے جو ناحق اپنی جان کھو بیٹھتا ہے۔ لوگوں میں ایسے واقعات کا ردِ عمل افسوس اور رحم کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی موت افسوسناک اور قابلِ رحم ہوتی ہے۔ تاہم یہ موت نہ تو موجبِ افتخار ہوتی ہے اور نہ ہی قابلِ توصیف ہوتی ہے کیونکہ مقتول کی کوئی خطا نہیں ہوتی بلکہ حریف کے بُغض، عناد اور نفرت کے نتیجے میں اُس کی جان رائیگاں چلی جاتی ہے۔

د۔ خودکشی

ایسی موت اپنی ہستی کو خود 'ضائع' کرنا ہے اور یہ اموات کی بدترین قسم ہے۔ خودکشی کے علاوہ اُن لوگوں کی اموات جو اپنی غفلت کی بنا پر سڑکوں وغیرہ کے حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ ان لوگوں کی بھی یہی صورت ہے جو کسی جرم کا ارتکاب کرتے ہوئے موت کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

ہ۔ شہادت

شہادت اُس شخص کی موت ہے جو تمام ممکنہ خطرات کا پُورا پُورا احساس کرتے ہوئے کسی مقدس مقصد کے حصُول کی خاطر یا قرآنی الفاظ میں فی سبیل اللہ

اپنی جان داؤ پر لگا دیتا ہے۔

شہادت کے دو پہلو ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ کی راہ میں کوئی مقدس مقصد حاصل کرنے کی خاطر جان کی قربانی دی جائے اور دوم یہ کہ یہ قربانی پورے شعور کے ساتھ اور برضا و رغبت ہو۔

عموماً شہادت کے معاملے میں ایک پہلو قاتل کے مجرم کا بھی ہوتا ہے۔ جہاں تک شہید کا تعلق ہے اُس کی موت ایک مقدس چیز ہوتی ہے اور جہاں تک قاتلوں کا تعلق ہے ان کا فعل وحشیانہ اور مجرمانہ ہوتا ہے۔

شہادت ایک جوانمردانہ اور قابلِ تحسین عمل ہے کیونکہ یہ ایک رضاکارانہ، شعوری اور بے لوث فعل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ صرف یہی ایک موت ہے جو زندگی سے بھی زیادہ عظیم، بلند اور مقدس ہوتی ہے۔

یہ بڑی افسوسناک بات ہے کہ بعض ذاکرین جو کربلا کے واقعات بیان کرتے ہیں گو وہ امام حسین علیہ السلام کو شہید کے مقدس لقب سے یاد کرتے ہیں اور سید الشہداء کہتے ہیں لیکن چونکہ وہ ان مسائل کا تجزیہ نہیں کر پاتے اس لیے واقعات کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے کہ امام علیہ السلام نے اپنی جان بلاوجہ ضائع کر دی ہو۔

ہمارے بہت سے لوگ امام حسینؑ کے مظلوم اور بے خطا ہونے کی بنا پر گریہ وزاری کرتے ہیں۔ انھیں اس بات کا رنج ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام بغیر کسی خطا کے ایک خود غرض اور جاہ طلب حاکم کی ہوا و ہوس کا شکار ہو گئے اور ان کی جان ضائع ہو گئی۔ اگر بات صرف یہی ہو تو امام حسینؑ کو مظلوم اور بے گناہ تو کہا جا سکتا ہے جس کے ساتھ شدید ناانصافی ہوئی ہو لیکن سید الشہداء تو کجا انھیں شہید بھی نہیں کہا جا سکتا۔

امام حسینؑ فقط دوسروں کی جاہ پسندانہ ہوس کا شکار نہیں ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے قاتلوں نے یہ جرم خود غرضی کی بنا پر کیا لیکن امامؑ آگاہی، شعور اور توجہ کے ساتھ قیام کر کے راہِ مقدس میں شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ آپ کے مخالفین نے آپ سے یزید کی بیعت، اس کی حکومت کی توثیق اور اس کے فرمان کو ماننے پر اصرار کیا اور آپ نے نتائج کو پوری طرح سمجھتے ہوئے اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آپ نے اس موقع پر خاموش رہنا ایک گناہِ عظیم سمجھا۔ آپ کی شہادت کی تاریخ اور بالخصوص آپ کے اقوال اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں۔ لہٰذا شہادت میں تقدس اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ انسان تمام نتائج کا شعور رکھتے ہوئے ایک مقدس مقصد کے حصول کی خاطر اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

شہید کی ذمہ داری

جس چیز کا انجام شہادت یعنی ایک مقدس مقصد کے لیے آگاہانہ جان نثار کرنا ہو اسے اسلام میں قانونی حیثیت حاصل ہے اور اس کا نام جہاد ہے فی الحال یہ ممکن نہیں کہ جہاد کی ماہیت پر تفصیل سے بحث کی جائے اور یہ طے کیا جائے کہ آیا اس کی ماہیت دفاعی ہوتی ہے یا جارحانہ؟ اور اگر دفاعی ہوتی ہے تو کیا یہ شخصی حقوق یا زیادہ سے زیادہ قومی حقوق کے دفاع تک محدود ہے یا اس کا دائرہ کار انسانی حقوق مثلاً آزادی اور عدالت تک وسیع ہے۔ اس سلسلے میں چند اور سوال بھی پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ آیا عقیدۂ توحید انسانی حقوق کا ایک حصہ ہے یا نہیں اور آیا خود قانونِ جہاد بنیادی طور پر آزادی کے حق کے منافی ہے یا نہیں۔ یہ بڑی دلکش اور مفید بحثیں ہیں جنھیں ان کے مناسب مقام

پر پیش کیا جانا چاہیے۔

فی الحال فقط اتنا بتا دینا کافی ہے کہ اسلام ایک ایسا دین نہیں جو یہ تعلیم دے کہ اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے آگے کر دو یا یہ کہ اللہ کا کام اللہ پر اور حاکم کا کام حاکم پر چھوڑ دو۔ اسی طرح یہ ایسا مذہب بھی نہیں جس کا کوئی مقدس اجتماعی نصب العین نہ ہو یا اگر ہو تو وہ اس کا دفاع کرنا ضروری نہ سمجھتا ہو۔

قرآن مجید نے اپنی بہت سی آیات میں تین مقدس مفاہیم کا ساتھ ذکر کیا ہے وہ ایمان ہجرت اور جہاد ہیں۔

جو شخص قرآن مجید پر پورا پورا ایمان رکھتا ہے وہ اپنے ایمان سے وابستہ اور ہر دوسری چیز سے آزاد ہوتا ہے وہ اپنے ایمان کی حفاظت کی خاطر ہجرت کرتا ہے اور اپنے معاشرے کے ایمان یا بہ الفاظ دیگر معاشرے کو بچانے کے لیے بے ایمان جابر کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ اگر ہم اس موضوع پر تمام قرآنی آیات اور احادیث رسولؐ نقل کریں تو گفتگو طویل ہو جائے گی لہٰذا ہم امام علیؑ کی نہج البلاغہ کے ایک خطبے سے چند جملے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

پہلے حصے میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"اِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَتَحَهُ اللّٰهُ لِخَاصَّةِ اَوْلِيَائِهِ"

"بلاشبہ جہاد بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جو اللہ نے اپنے برگزیدہ دوستوں کے لیے کھولا ہے"

جہاد بہشت کا دروازہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ہر ایک کے لیے نہیں کھولا۔ ہر شخص اس قابل نہیں کہ یہ دروازہ اس کے لیے کھولا جائے۔ ہر شخص صاحب

بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اللہ نے یہ دروازہ اپنے خاص دوستوں کے لیے کھولا ہے۔ ایک مجاہد کا رتبہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ ہم اُسے فقط اللہ کا دوست ہی نہیں کہتے بلکہ وہ اللہ کا برگزیدہ دوست ہوتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بہشت کے اتنے دروازے اس لیے نہیں ہیں کہ کہیں بھیڑ نہ لگ جائے کیونکہ دوسری دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ پیدا ہونے کا امکان نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ تمام بندوں کا حساب کتاب ایک آن میں کر سکتا ہے (وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ) اسی طرح وہ ان سب کو ایک دروازے سے بہشت میں داخل کر سکتا ہے۔ وہاں باری سے داخل ہونے یا انتظار لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ دروازے مختلف طبقوں کے لوگوں کے لیے بھی نہیں کیونکہ دوسری دنیا میں کوئی طبقاتی فرق نہیں ہوگا۔ بلاشبہ وہاں لوگوں کی درجہ بندی سماجی حیثیت یا پیشے کے لحاظ سے نہیں کی جائے گی۔

وہاں لوگوں کے درجوں اور گروہوں کا تعین ان کے ایمان، نیک اعمال اور تقویٰ کی بنیاد پر کیا جائے گا اور ہر گروہ کی موجودہ دنیا میں روحانی ترقی کی مناسبت سے اس کے لیے ایک دروازہ کھولا جائے گا۔ دراصل دوسری دنیا موجودہ دنیا کی ہی ایک ملکوتی شکل ہے۔ جس دروازے سے مجاہدین اور شہداء بہشت میں داخل ہوں گے اور بہشت کا جو حصہ ان کے لیے علیحدہ کر دیا گیا وہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ دوستوں کے لیے مخصوص ہے جن پر اس کی خاص الخاص رحمت نازل ہوگی۔

دوسرے حصے میں کہا گیا ہے کہ:

"وَهُوَ لِبَاسُ التَّقْوٰى"

"جہاد تقویٰ کا لباس ہے"

لباسِ تقویٰ' کی اصطلاح قرآنِ مجید نے سورۃ الاعراف میں استعمال کی ہے۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جہاد تقویٰ کا لباس ہے۔ تقویٰ کے معنی ہیں پاکیزگی کے ہیں یعنی اس روحانی اور اخلاقی آلودگی سے پاکیزگی جس کی جڑیں خود غرضی، حسد، غرور، حرص اور بخل میں پیوست ہوں۔ اس بنا پر ایک حقیقی مجاہد سب سے بڑھ کر متقی ہوتا ہے۔ وہ پاکیزہ ہوتا ہے کیونکہ وہ خود غرضی، حسد، غرور، حرص اور بخل سے پاک ہوتا ہے۔ ایک مجاہد تمام پاکیزہ لوگوں سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے کیونکہ وہ عظیم مقصد کے حصول کی خاطر اپنی ہستی کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ جو دروازہ اس کے لیے کھولا جاتا ہے وہ ان دروازوں سے مختلف ہوتا ہے جو دوسرے متقی لوگوں کے لیے کھولے جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآنِ مجید سے پتا چلتا ہے تقویٰ کے بھی کئی درجے ہیں:

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ
اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور نیک کام کیے ان پر جو کچھ وہ کھا پی چکے ہیں اس میں کوئی گناہ نہیں۔ جب انھوں نے تقویٰ اختیار کیا، ایمان لے آئے اور نیک کام کیے اور پھر تقویٰ اختیار کیا اور ایمان لے آئے اور بار دیگر تقویٰ اختیار کیا اور نیکیاں کیں۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

(سورۃ المائدۃ ۵۔ آیت ۹۳)

اس آیۂ کریمہ سے معارفِ قرآن کے دو لطیف نکتوں کا پتا چلتا ہے

پہلا نکتہ یہ ہے کہ ایمان اور تقویٰ کے مختلف درجے ہیں۔ اس وقت یہی نکتہ زیرِ بحث ہے۔ دوسرے نکتے کا تعلق فلسفۂ حیات اور حقوقِ انسانی سے ہے۔

قرآنِ مجید یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمام اچھی چیزیں ایماندار، پرہیزگار اور نیک لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہونے کا حقدار اس وقت بنتا ہے جب وہ ارتقا کے اُس راستے پر گامزن ہو جو فطرت نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ یہ راستہ ایمان، پرہیزگاری اور نیک اعمال کا ہے۔

مسلمان علماء نے اس آیت اور دوسری اسلامی کتابوں میں جو کچھ وضاحت سے یا اشارتاً کہا ہے اس سے فیضان حاصل کر کے تقویٰ کو مندرجہ ذیل تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) ——— عام تقویٰ

(۲) ——— خاص تقویٰ

(۳) ——— خاص الخاص تقویٰ

مجاہدین کا تقویٰ بلند ترین فداکاری سے عبارت ہے۔ وہ اپنا سب کچھ اخلاص کے طشت میں رکھ کر بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیتے ہیں۔

تیسرے حصّے میں کہا گیا ہے کہ:

"وَدِرْعُ اللهِ الْحَصِيْنَةُ وَجُنَّتُهُ الْوَثِيْقَةُ"

"جہاد اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی زرہ ہے جس پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کر سکتا اور یہ اس کی ایک قابلِ اعتماد سپر بھی ہے"

جب امّتِ مسلمہ جہاد کے جذبے سے سرشار رہتی ہے تو دشمن اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ زرہ لوہے کی کڑیوں سے تیار کیا ہوا ایک ایسا لباس ہوتا ہے جو قمیص کی طرح پہنا جاتا ہے اور اس سے دشمن کا وار بے اثر بنانے میں مدد

ملتی ہے جب کہ سپر ہاتھ میں پکڑی جاتی ہے اور اس سے دشمن کا وار روکنے کا کام لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام علی علیہ السلام نے جہاد کو زرہ اور سپر دونوں سے تشبیہ اس لیے دی ہے کہ بعض اوقات جہاد کی نوعیت پیش بندی کی ہوتی ہے اور وار روکنا مقصود ہوتا ہے اور بعض اوقات جہاد کا مقصد مقابلہ کرنا اور دشمن کے وار بے اثر بنانا ہوتا ہے۔

چوتھے حصے میں کہا گیا ہے کہ:

فَمَنْ تَرَكَهُ رَغْبَةً عَنْهُ أَلْبَسَهُ اللهُ ثَوْبَ الذُّلِّ وَشَمِلَهُ الْبَلَاءُ وَدُيِّثَ بِالصَّغَارِ وَالْقَمَاءَةِ وَضُرِبَ عَلَىٰ قَلْبِهِ بِالْإِسْهَابِ وَأُدِيلَ الْحَقُّ مِنْهُ بِتَضْيِيعِ الْجِهَادِ وَسِيمَ الْخَسْفَ وَمُنِعَ النَّصَفَ ؛

"جو شخص جہاد سے بے رغبتی کے سبب منہ پھیرے اللہ اُسے ذلت کا لباس پہناتا ہے اور حقارت کے نیچے روندڈالتا ہے۔ اس کے دل کی بصیرت پر پردے ڈال دیتا ہے اور اس کی قوت ادراک سلب کر لیتا ہے۔ جہاد کو ضائع کرنے کی پاداش میں اس سے سچائی کی دولت چھین لی جاتی ہے اور وہ مشکلات اور پریشانیوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور انصاف سے محروم ہو جاتا ہے۔"

پہلے تین حصوں کے برعکس جن میں جہاد کے مثبت نتائج کا ذکر کیا گیا ہے اس حصے میں جہاد ترک کرنے کے منفی اثرات بیان کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ ان جملوں کے مضمون سے ظاہر ہے جو منفی اثرات ان میں بیان کیے گئے ہیں وہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہیں یعنی ان کا تعلق فرد سے نہیں بلکہ پورے

معاشرے سے ہے۔

وہ منفی اثرات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ ذلت اور خواری: جو قوم جہاد کے جذبے سے محروم ہوجائے وہ یقیناً ذلیل وخوار ہوجاتی ہے۔

ب۔ مصیبتیں اور پریشانیاں: ان لوگوں کے خیال کے برعکس جو ذلت اور خواری کو اپنی پناہ گاہ سمجھتے ہیں یہ چیز انھیں سینکڑوں مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کردیتی ہے۔

ج۔ روحانی پستی۔

د۔ بصیرت اور قوت ادراک سے محروم ہوجانا: یہ ایک عجیب نکتہ ہے کہ امام علی علیہ السلام دل کی بصیرت اور قلب کی روشنی کو جذبۂ جہاد پر موقوف سمجھتے ہیں۔ اسلام کی منطق میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ بصیرت عمل سے پیدا ہوتی ہے لیکن کہیں بھی جہاد کی مانند ایک اجتماعی عمل کو معنویت اور سلوک الی اللہ کے ارکان میں سے ایک رکن شمار نہیں کیا گیا جس کے ترک کرنے سے دل پر پردہ پڑجائے۔

ھ۔ جہاد ترک کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو سچائی کی دولت بخشی گئی ہو وہ ان سے چھین لی جاتی ہے اور پھر وہ اس قابل نہیں رہتے کہ انھیں اسلام کے علمبردار اور حق کے داعی شمار کیا جائے۔

و۔ دوسروں کی جانب سے انصاف سے محروم ہوجانا یعنی جو قوم مجاہد ہو دوسرے اسے اہمیت دیتے ہیں اور مجبوراً اس کے ساتھ

منصفانہ برتاؤ کرتے ہیں لیکن جو قوم اس خصوصیت سے محروم ہوجائے دوسرے اس کی پرواہ نہیں کرتے اور اس سے انصاف کرنے میں بھی تساہل برتتے ہیں۔

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"اَلْخَيْرُ كُلُّهُ فِي السَّيْفِ وَتَحْتَ ظِلِّ السَّيْفِ"

(تہذیب الاحکام بشیخ طوسیؒ۔ جلد ۲۔ کتاب الجہاد)

"خیر و برکت تلوار میں اور تلوار کے سائے تلے ہوتی ہے"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

"اِنَّ اللّٰهَ اَعَزَّ اُمَّتِيْ بِسَنَابِكِ خَيْلِهَا وَمَرَاكِزِ رِمَاحِهَا"

(تہذیب الاحکام بشیخ طوسیؒ۔ جلد ۲۔ کتاب الجہاد)

"اللہ نے میری امت کو اُن کے گھوڑوں کے سموں اور ان کے نیزوں کے نشانوں کی وجہ سے عزت دی ہے"

اس کے معنی یہ ہیں کہ ملتِ اسلامیہ ہی ملتِ قوت و قدرت کا دوسرا نام ہے۔ اسلام قوت و قدرت کا دین ہے۔ یہ مجاہدین پیدا کرتا ہے۔ مشہور فلسفی اور مؤرخ ول دوراں (Will Durant) اپنی کتاب 'تاریخ تمدن' میں کہتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے جتنا زور اسلام نے اپنے پیروؤں پر دیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں دیا۔

ایک اور صحیح حدیث کے مطابق رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ:

"مَنْ لَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِغَزْوٍ مَاتَ عَلَىٰ شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ"

"جو شخص جہاد میں شریک نہیں ہوا اور جس نے جہاد میں شریک

ہونے کے بارے میں سوچا تک نہیں وہ منافق کی موت مرے گا"

یعنی جہاد میں شرکت یا کم از کم اس میں شرکت کی خواہش کو اسلام سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور جہاد ایک شخص کے ایمان کی صداقت کا معیار ہے۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے دریافت کیا گیا:

"مَا بَالُ الشَّهِيْدُ لَا يُفْتَنُ فِيْ قَبْرِهِ"

"قبر میں شہید کی آزمائش کیوں نہیں ہوتی؟"

(یعنی اس سے قبر اور برزخ میں سوال وجواب کیوں نہیں کیے جاتے)

آپ نے فرمایا:

"كَفٰى بِالْبَارِقَةِ فَوْقَ رَاْسِهِ فِتْنَةً"

"شہید کے سر پر تلوار کی چمک سے ہی اُس کی آزمائش ہو جاتی ہے اور وہ پہلے ہی سوالوں کا جواب دے چکا ہے"

مطلب یہ ہے کہ چونکہ شہید عملی طور پر اپنے ایمان کی صداقت ثابت کر دیتا ہے اس لیے عالمِ برزخ میں اُس سے مزید سوال پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

شہید کا اشتیاق

جو خصوصیات صدرِ اسلام کی تاریخ سے واضح طور پر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک خاصیت وہ خاص ذہنیت ہے جو صدرِ اول کے بہت سے مسلمانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں اس ذہنیت کو کیا نام دوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا موزوں ترین نام "شوقِ شہادت" ہے۔ شہادت کے شائق ان مسلمانوں میں امام علی علیہ السلام کا اسمِ گرامی سرِفہرست ہے۔

وہ خود فرماتے ہیں:

"جب یہ آیت نازل ہوئی کہ:

"اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ" (سورۃ العنکبوت ۔ آیت ۲)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ فقط اتنا کہنے سے کہ ہم ایمان لائے انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا"

تو میں سمجھ گیا کہ جب تک آنحضرتؐ زندہ ہیں مسلمانوں کی کوئی آزمائش نہیں کی جائے گی۔ میں نے رسولؐ اللہ سے پوچھا کہ یہ آزمائش کیا ہوگی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے بعد لوگ باہمی جھگڑوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا: کیا آپ نے جنگِ اُحد کے دن جب کئی ایک مسلمان شہید ہو گئے تھے اور میں شہادت سے محروم رہا تھا اور مجھے یہ بات ناگوار گزری تھی مجھ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم تمھیں خوشخبری دیتے ہیں کہ تمھیں شہادت نصیب ہوگی۔ آپؐ نے فرمایا: یہ درست ہے تمھیں شہادت نصیب ہوگی۔ اب یہ بتاؤ کہ اُس وقت تمھارے صبر کا کیا عالم ہوگا؟ میں نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! یہ صبر کا نہیں بلکہ شکر کا مقام ہوگا۔ پھر آنحضرتؐ نے جو فتنہ بعد میں برپا ہونے والا تھا اُس کے متعلق مجھے تفصیل سے بتایا۔"

یہ ہیں معنی شوقِ شہادت کے۔ امام علی علیہ السلام شہادت کی امید پر زندہ تھے۔ اگر ان کی یہ امید ان سے لے لی جاتی تو ان کی زندگی بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

ہم لوگ اکثر امام علی علیہ السلام کے نام کا ورد کرتے ہیں اور ان کے محب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر محض زبانی جمع خرچ ہی کافی ہوتا تو روئے زمین پر ہم سے بہتر شیعہ اور کوئی نہ ہوتا لیکن حقیقی تشیع کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلیں۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ ان کے کردار کا فقط ایک نمونہ ہے۔

امام علی علیہ السلام کے علاوہ اور بھی کئی ایک بزرگوار ایسے گزرے ہیں جنھیں شہادت کا بے حد اشتیاق تھا۔ صدرِ اسلام کا ہر مسلمان اللہ سے شہادت کے رتبے پر فائز ہونے کی دعا مانگتا تھا جیسا کہ ہمارے ائمہ علیہم السلام کی ان مناجاتوں سے پتا چلتا ہے جو ہم تک پہنچی ہیں۔

ماہِ رمضان المبارک کی راتوں میں پڑھی جانے والی دعا میں ہم کہتے ہیں:

" اَللّٰهُمَّ بِرَحْمَتِكَ فِي الصَّالِحِيْنَ فَاَدْخِلْنَا وَفِيْ عِلِّيِّيْنَ فَارْفَعْنَا وَقَتْلاً فِيْ سَبِيْلِكَ مَعَ وَلِيِّكَ فَوَفِّقْ لَنَا "

"اے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری راہ میں اور تیرے ولی (امام) کے ہمراہ قتل ہو جائیں اور شہادت کی سعادت حاصل کریں"

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہر جوان، بوڑھے، بچے، امیر اور غریب کے دل میں شہادت کا شوق اور ولولہ موجود تھا۔ بعض اوقات لوگ آنحضرتؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے کہ وہ جہاد میں شریک ہونا چاہتے ہیں تاکہ اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے قتل ہو جائیں وہ آنحضرتؐ سے استدعا کرتے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ان کی شہادت کی

دعا مانگیں۔

سفینۃ البحار میں خیثمہ (یا خیثمہ) نامی ایک شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اور اس کا بیٹا ایک غزوہ میں شرکت کرنے اور رتبۂ شہادت پر فائز ہونے کے لیے بے چین تھے۔ اب سوال یہ تھا کہ ان دونوں میں سے کون یہ سعادت حاصل کرے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے قرعہ اندازی کی گئی اور قرعہ بیٹے کے نام نکلا چنانچہ وہ جنگ میں شریک ہوا اور شہید ہو گیا۔

کچھ مدت گزرنے کے بعد خواب میں باپ کی ملاقات بیٹے سے ہوئی اور اس نے اُسے بے حد خوش و خرم پایا۔ بیٹے نے باپ سے کہا:

إِنَّهُ قَدْ وَعَدَنِيْ رَبِّيْ حَقًّا

یعنی جو کچھ ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا تھا وہ حق تھا اور اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔

بوڑھا باپ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب کہہ سنایا۔ پھر اس نے کہا:

"یا رسول اللہ! گو میں اب بہت بوڑھا اور کمزور ہو چکا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ جہاد میں شرکت کروں اور لڑتے لڑتے شہید ہو جاؤں۔ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ میری یہ آرزو پوری کر دے۔"

آنحضرتؐ نے اس کی خواہش کے مطابق دعا کی۔ ابھی زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ اس پیر مرد کو نہ صرف یہ کہ ایک اور غزوہ میں شریک ہونے کا موقع ملا بلکہ شہادت بھی نصیب ہوئی۔

اُسی زمانے میں ایک اور شخص بھی گزرا ہے جس کا نام عمرو بن جموح تھا۔

اس کے کئی ایک بیٹے تھے۔ وہ خود ایک ٹانگ سے لنگڑا تھا اور اس بنا پر اسلامی قانون کے مطابق جنگ میں حصّہ لینے سے مستثنیٰ تھا کیونکہ قرآن مجید فرماتا ہے:

"لَیْسَ...... عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ ....

(سورۃ الفتح۔ آیت ۱۷)

جنگِ اُحد کے موقع پر اُس کے تمام بیٹے ہتھیاروں سے لیس ہو گئے۔ خود اس نے بھی یہ طے کیا کہ جنگ میں شرکت کرے گا اور لڑتے لڑتے جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دے گا۔ اُس کے بیٹوں نے اُس کے اِس فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ گھر پر ہی رہے کیونکہ شرعاً اس کے لیے جہاد میں حصّہ لینا ضروری نہیں۔ تاہم وہ جنگ میں شرکت پر مصر رہا۔ اُس کے بیٹوں نے اپنے قبیلے کے سربرآوردہ اشخاص کو بلایا تاکہ وہ اس پر دباؤ ڈالیں اور اسے اس کے ارادے سے باز رکھیں لیکن انھیں بھی اس بارے میں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور عمرو بن جموح اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

جب بیٹوں اور قرابت داروں نے اُسے جنگ میں شرکت سے باز رہنے کے لیے بہت مجبور کیا تو عمرو، رسولؐ اللہ کی خدمتِ اقدس میں پہنچا اور عرض کیا:

"یا رسولؐ اللہ! میرے بیٹے مجھے شہادت حاصل کرنے سے کیوں روکتے ہیں؟ اگر شہادت دوسروں کے لیے اچھی چیز ہے تو میرے لیے بھی اچھی ہونی چاہیے"۔

تب رسولِ اکرمؐ نے اُس کے بیٹوں کو بلا کر کہا کہ وہ اُسے جہاد میں شریک ہونے سے نہ روکیں۔ آپ نے فرمایا:

"یہ شخص شہادت کے لیے بیتاب ہے۔ گو اس پر جہاد میں شریک ہونا واجب نہیں تاہم حرام بھی نہیں لہٰذا اگر یہ جہاد میں شریک ہونا چاہے تو اسے مت روکو"۔

بوڑھا شخص یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً اپنے بدن پر ہتھیار سجائے اور جنگ میں شامل ہونے کے لیے روانہ ہوگیا۔

میدانِ جنگ میں اس کا بیٹا اس پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ اس نے دیکھا کہ سن رسیدہ اور کمزور ہونے کے باوجود اس کا باپ بڑے جوش اور دلاوری سے لڑ رہا ہے۔ بالآخر اس بوڑھے مجاہد نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس کا ایک بیٹا بھی اس جنگ میں کام آیا۔ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اُحد مدینہ کے قریب واقع ہے۔ یہاں مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا اور ان کی حالت مخدوش ہوگئی۔ اس دوران میں مدینے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مسلمانوں کو شکست ہوگئی ہے۔ مدینہ کے مرد اور عورتیں جس قدر جلد ہوسکا اُحد کی جانب روانہ ہوگئے۔ انھیں لوگوں میں ایک عمرو بن جموح کی بیوی بھی تھی۔ اُس نے میدانِ اُحد میں پہنچ کر اپنے شوہر، بیٹے اور بھائی کی لاشیں ڈھونڈھ نکالیں اور انھیں ایک اونٹ پر لاد کر جنت البقیع کے قبرستان میں دفن کرنے کے ارادے سے مدینہ روانہ ہوگئی۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ اس کا اونٹ جو خاصا قوی ہیکل تھا مدینہ کی جانب بہت آہستہ اور رُک رُک کر چل رہا ہے۔

عمرو بن جموح کی بیوی کو راستے میں کچھ عورتیں ملیں جو اُحد کی طرف جارہی تھیں ان میں رسول اکرمؐ کی زوجہ اُم المومنین جناب عائشہ بھی تھیں۔

جناب عائشہ کے دریافت کرنے پر عمرو کی بیوی نے بتایا کہ میں اُحد سے آرہی ہوں۔ پھر ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی۔

"تم نے اُونٹ پر کیا لاد رکھا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ فقط میرے شوہر، بیٹے اور بھائی کی لاشیں ہیں۔ میں انھیں دفن کرنے کے لیے مدینے جا رہی ہوں۔"

"رسول اللہ کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"الحمدللہ! رسولِ اکرمؐ بالکل خیریت سے ہیں۔ اللہ نے کافروں کے منصوبے خاک میں ملا دیے ہیں۔ جب تک آنحضرتؐ سلامت ہیں، کوئی مصیبت مصیبت نہیں ہے۔"

پھر عمرو کی بیوی نے بتایا کہ میرے اونٹ کی حالت عجیب ہو گئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینے نہیں جانا چاہتا۔ اسے تو چارہ کھانے کے لیے خوشی خوشی اپنی ناند کی طرف جانا چاہیے تھا لیکن لگتا ہے کہ یہ واپس اُحد جانا چاہتا ہے۔

زوجۂ رسولؐ نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ ان کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں چلی چلے اور انھیں سارا واقعہ بتائے۔

جب عمرو کی بیوی رسولِ اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو اس نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! میرا قصہ بڑا عجیب ہے۔ یہ اونٹ مدینے کی جانب بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا لیکن اُحد کی طرف بڑی آسانی سے آیا ہے۔"

آنحضرتؐ نے دریافت کیا:

"کیا تمھارے شوہر نے گھر سے روانہ ہوتے وقت کچھ کہا تھا؟"

وہ کہنے لگی:

"جی ہاں! جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تھی یا اللہ! اب مجھے دوبارہ اس گھر میں نہ لانا۔"

حضورؐ نے فرمایا:

"یہی بات ہے۔ تمھارے شوہر کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ اب اسے دوسرے

شہداء کے ساتھ اُحد میں ہی دفن ہونے دو۔"

امیرالمومنین امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرمایا کرتے تھے :

" لَاَلْفُ ضَرْبَةٍ بِالسَّيْفِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ مِيْتَةٍ عَلٰى فِرَاشٍ "

"بستر پر مرنے کی بجائے میں یہ زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میرے سر پر تلوار کی ہزار ضربیں لگ جائیں جن کے نتیجے میں میں مارا جاؤں۔"

کربلا کی جانب سفر کے دوران امام حسین علیہ السلام چند شعر پڑھتے تھے کہا جاتا ہے کہ آپ کے والدِ بزرگوار بھی یہ اشعار اکثر پڑھا کرتے تھے۔

فان تکن الدنیا تعد نفیسه
فدار ثواب الله اعلی وانبل
وان تکن الاموال للترك جمعها
فما بال متروك به المرء یبخل
وان تکن الابدان للموت انشأت
فقتل امرء بالسیف فی الله اجمل

ان اشعار کا مفہوم درج ذیل ہے

اگرچہ دنیا خوبصورت اور محبت کے قابل ہے لیکن یہ انسان کو اپنی طرف کھینچتی ہے جب کہ اللہ کی جانب سے مکافات کا گھر یعنی دارِ آخرت اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور عالیشان ہے۔

اگر جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ یہیں رہ جاتا ہے تو پھر انسان اسے اللہ کی راہ میں کیوں نہ خرچ کرے۔

اور اگر ہمارے بدن اس لیے تخلیق کیے گئے ہیں کہ آخر کار مرجائیں تو

پھر انسان کا خدا کی راہ میں تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔

شہید کی منطق

ہر شخص اور ہر گروہ کی ایک منطق یعنی سوچنے کا ایک انداز ہوتا ہے۔ ہر شخص کے ذہن میں کچھ معیار اور کچھ پیمانے ہوتے ہیں اور وہ ان ہی معیاروں اور پیمانوں کے مطابق فیصلے کرتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

شہید کی ایک خاص منطق ہوتی ہے۔ شہید کی منطق کو معمولی افراد کی منطق کے پیمانے سے ناپنا ممکن نہیں اور نہ ہی شہید کو ان لوگوں کی منطق میں سمویا جا سکتا ہے۔ اس کی منطق ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ وہ ایک ایسی منطق ہے جو ایک طرف عشق کی منطق اور دوسری طرف اصلاح اور مصلح کی منطق سے مل کر بنتی ہے۔

یعنی اگر معاشرے کے ہمدرد ایک مصلح کی منطق اور اپنے پروردگار کے دیدار کے عاشق ایک عارف کی منطق کو ملا دیا جائے یا دوسرے الفاظ میں اگر اللہ تعالیٰ کے عاشق ایک عارف کی منطق اور ایک مصلح کی منطق جمع ہو جائیں تو اس امتزاج سے ایک شہید کی منطق وجود میں آتی ہے۔

مناسب ہوگا کہ ہم اس نکتے کی مزید وضاحت کریں۔ جب امام حسینؑ نے کوفہ جانے کا فیصلہ کیا تو آپ کے خاندان کے چند مصلحت اندیش افراد نے آپ کو اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ آپ کا فیصلہ منطقی نہیں۔ اپنی جگہ وہ بھی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ امام حسینؑ کا فیصلہ ایک دنیا دار شخص کی منطق سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جس کی منطق ذاتی مصلحتوں اور منفعتوں پر مبنی ہوتی ہے بلکہ آپ کی منطق عام لوگوں کی منطق سے بلند تر تھی۔

آپ کی منطق ایک شہید کی منطق تھی جسے سمجھنا ہر کہ و مہ کا کام نہیں۔

عبداللہ ابن عباسؓ اور محمد بن حنفیہؒ کوئی معمولی اشخاص نہیں تھے بلکہ سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے تاہم ان لوگوں کی منطق کی بنیاد ذاتی مفادات اور سیاسی فوائد پر تھی جس کا مقصد شخصی فائدہ اور دشمن پر غلبہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یقیناً ان کی منطق کے مطابق امام حسینؑ کا فعل احتیاط اور مصلحت کوشی سے قطعاً ہم آہنگ نہیں تھا۔

ابن عباسؓ نے ایک تجویز پیش کی جو سیاسی نقطۂ نظر سے بڑی معقول تھی چالاک لوگوں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ دوسروں کو مہرے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کو آگے دھکیلتے ہیں اور خود پیچھے رہتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے اشخاص کامیاب ہو جائیں تو یہ بھی ان کی کامیابی سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تب بھی انھیں کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ایسے ہی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابن عباسؓ نے امام حسینؑ سے کہا:

> "کوفہ کے لوگوں نے آپ کو لکھا ہے کہ وہ آپ کی مدد کے لیے حاضر ہیں۔ آپ انھیں جواب میں لکھیے کہ وہ پہلے یزید کے عہدیداروں کو وہاں سے نکال باہر کریں اور وہاں کے حالات کو معمول پر لے آئیں (پکڑ لو، باندھ دو اور پھر ان کو مجھ شجاع کے حوالے کر دو)! وہ یا تو آپ کے کہنے کے مطابق عمل کریں گے اور یا نہیں کریں گے۔ اگر وہ ایسا کر گزریں تو آپ بڑے اطمینان سے وہاں جا سکتے ہیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو آپ کسی خطرے میں نہیں پڑیں گے۔"

امام علیہ السلام نے ابن عباسؓ کی اس تجویز پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ ہم نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ابنِ عباسؓ نے کہا:

"آپ قتل ہو جائیں گے۔"

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"تو کیا ہوا؟"

ابنِ عباسؓ نے کہا:

"جو شخص یہ جانتا ہو کہ اس کا قتل ہو جانا ممکن ہے اسے اپنے بیوی بچوں کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے۔"

امام حسینؑ نے جواب دیا:

"لیکن میں انھیں ضرور ساتھ لے جاؤں گا۔"

ایک شہید کی منطق الگ ہی ہوتی ہے۔ شہید کی منطق جلنے اور روشنی بخشنے کی منطق ہے۔ یہ منطق معاشرے کے احیاء کے لیے اس میں جذب اور تحلیل ہو جانے کی منطق ہے۔

یہ انسانی اقدار کے مُردہ جسم میں روح پھونکنے کی منطق ہے۔ یہ ولولہ انگیزی کی منطق ہے۔ یہ ایک ایسی منطق ہے جس کے مطابق انسان بہت دور تک دیکھ سکتا ہے۔

شہید کے لفظ کے گرد تقدس کا جو ہالہ بنا ہوا ہے اور یہ لفظ دوسرے سب لفظوں سے زیادہ عالی شان اور مقدس ہے اس کی وجہ یہی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہیرو سے بڑھ کر ایک اور ہیرو ہے اور ایک مصلح سے بڑھ کر ایک اور مصلح ہے لیکن شہید کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کی جگہ کوئی اور لفظ نہیں لے سکتا۔

شہید کا خون

شہید کیا کرتا ہے؟ اُس کا کام فقط یہ نہیں کہ دشمن کے مقابلے میں اُٹھ کھڑا ہو اور اس کارروائی کے دوران میں یا تو اُسے ضرب لگائے اور یا اُس سے ضرب کھائے۔ اگر یہ صورت ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ جب اس کا خون بہتا ہے تو وہ رائیگاں جاتا ہے۔ تاہم ایک شہید کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ یہ خون زمین پر نہیں بہتا بلکہ اس کا ہر قطرہ سینکڑوں ہزاروں قطروں بلکہ خون کا ایک دریا بنکر قوم کے بدن میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"مَا مِنْ قَطْرَةٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ مِنْ قَطْرَةِ دَمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ"

"اللہ کسی قطرے کو اتنا پسند نہیں کرتا جتنا اُس خون کے قطرے کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں بہتا ہے"

شہادت ایک معاشرے کے بدن میں خون کا انتقال ہے بالخصوص ایسے معاشرے کے بدن میں جسے خون کی کمی کا عارضہ لاحق ہو۔ یہ شہید ہی ہے جو تازہ خون معاشرے کی شریانوں میں پہنچاتا ہے۔

شہید کی ولولہ انگیزی

ایک شہید کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوم میں ہمت اور ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ جن قوموں میں جوش اور بالخصوص الٰہی جوش کی رُوح مر جاتی ہے شہید اُن کے اندر دوبارہ دلاوری، صبر، ہمت اور جوش پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کو ہمیشہ شہداء کی ضرورت رہی ہے۔ ایک قوم

کے احیاء کے لیے اس کے اندر جوش اور ولولے کی بحالی بے حد ضروری ہے۔

شہید کا جاودانی ہونا

ایک عالم اپنے علم کے ذریعے معاشرے کی خدمت کرتا ہے۔ درحقیقت وہ علم کے راستے سے اپنی انفرادیت سے نکل کر معاشرے سے پیوستہ ہو جاتا ہے اور اس کی انفرادی شخصیت علم کے ذریعے ہی معاشرے کی شخصیت سے متحد ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ایک قطرہ سمندر سے متحد ہو جاتا ہے۔ درحقیقت معاشرے سے اس اتحاد کی بدولت وہ عالم اپنی شخصیت کے ایک حصے یعنی اپنے افکار و خیالات کو زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔

ایک موجد اپنی ایجادات کے ذریعے معاشرے سے پیوستہ ہو جاتا ہے۔ وہ معاشرے کی خدمت کرتا ہے اور اپنی مہارت اور ایجادات کی بدولت زندۂ جاوید ہو جاتا ہے۔ ایک شاعر اپنے اشعار کی بدولت اور ایک معلم اخلاق اپنے اُن زریں اقوال کے ذریعے جاودانی زندگی حاصل کر لیتا ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ایک شہید اپنے خون کے ذریعے معاشرے میں لافانی زندگی حاصل کر لیتا ہے یعنی وہ معاشرے کے اندر ہمیشہ باقی رہنے والا خون پیدا کرتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں ایک عالم اپنے خیالات کو، ایک فنکار اپنے فن پارے کو، ایک موجد اپنی ایجادات کو اور ایک معلم اخلاق اپنی تعلیمات کو لافانی بنا دیتا ہے لیکن ایک شہید اپنے خون کو اور درحقیقت اپنے پورے وجود اور ہستی کو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے اس کا خون ہمیشہ اس کی قوم کی شریانوں میں دوڑتا رہتا ہے۔ دراصل باقی لوگ اپنے اثاثے کے ایک حصے کو جاودانی بناتے ہیں لیکن شہید اپنے پورے اثاثے کو لافانی بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے:

"فَوْقَ كُلِّ ذِي بِرٍّ بِرٌّ حَتَّى يُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَإِذَا قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَلَيْسَ فَوْقَهُ بِرٌّ"

"ہر نیکوکار سے بڑھ کر ایک اور نیکوکار ہے لیکن اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے سے بڑھ کر کوئی اور نیکوکار نہیں ہے"

شہید کی شفاعت

ایک حدیث کے مطابق تین قسم کے لوگ یعنی انبیائے کرامؑ، علماء اور شہداء قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے دوسروں کی شفاعت کر سکیں گے (اس حدیث میں گو ائمہ کا نام بالتصریح نہیں لیا گیا لیکن روایت ہمارے ائمہ سے ہے۔ لہٰذا علماء سے مراد علماء ربانی ہیں جن میں سب سے پہلے تو خود ائمہ اطہارؑ شامل ہیں اور پھر وہ علماً ہیں جو اُن کی پیروی کرتے ہیں)۔

انبیائے کرامؑ کی جانب سے شفاعت ایک واضح امر ہے اور اب ہمیں جس شفاعت کا ادراک کرنا ہے وہ شہداء کی شفاعت ہے۔ شہداء کو شفاعت کا حق اس لیے حاصل ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی راہِ راست کی جانب کرتے ہیں۔ ان کی شفاعت دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی صورت گری ہوگی [1]

امیر المومنین امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا ہے:

---

[1] حدیث شریف کے مطابق چونکہ عاقبت کی جزا وسزا اس دنیا میں کیے گئے اعمال کا عکس العمل ہے اس لیے اس میں کسی نہ کسی صورت میں ان اعمال کی ماہیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ شہدا نے اپنی جانیں مظلوموں اور بیکسوں کے حقوق کی حفاظت کی خاطر قربان کیں اور ہمیشہ ان کی مدد پر کمربستہ رہے اس لیے اگلی دنیا میں بھی انھیں ان لوگوں کی شفاعت کی اجازت دی جائے گی جنھیں معافی کی اشد ضرورت ہوگی۔

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن شہدار کو اس شان و شوکت اور عظمت اور نورانیت کے ساتھ سامنے لائے گا کہ انبیائے کرام اگر سوار ہوں گے تو ان کی تعظیم کی خاطر سواریوں سے اتر پڑیں گے"

شہید کا ماتم

صدر اسلام میں جو لوگ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں شہید ہوئے اُن میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے جنگ اُحد میں شہادت پائی اور اُس زمانے میں انھیں "سید الشہداء" کا لقب دیا گیا۔ جن لوگوں کو مدینہ منورہ میں زیارات کی سعادت نصیب ہوئی ہے انھوں نے اُحد میں بھی ضرور حاضری دی ہوگی اور حضرت حمزہؓ کی قبر کی زیارت کی ہوگی۔

جب حضرت حمزہؓ نے مکّے سے مدینہ ہجرت کی اُس وقت وہ تنہا تھے اور کوئی شخص ان کے ساتھ ان کے گھر میں نہیں رہتا تھا۔ جب رسولِ اکرمؐ اُحد سے واپس مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت حمزہؓ کے گھر کے سوا تمام شہداء کے گھروں میں گریہ ماتم ہو رہا ہے۔ اس پر آپ نے فقط ایک جملہ ادا فرمایا:

"اَمَّا حَمْزَةُ فَلَا بَوَاكِيَ لَهُ"

"کیا حمزہ کو رونے والا کوئی نہیں؟"

صحابہ یہ سُن کر اپنے اپنے گھروں میں گئے اور عورتوں کو بتایا کہ رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ حمزہؓ کو رونے والا کوئی نہیں۔ یہ سننے کی دیر تھی کہ تمام عورتیں جو اپنے بیٹوں، شوہروں یا بھائیوں کو رو رہی تھیں حضرت حمزہؓ کے گھر پہنچیں اور رسولِ اکرمؐ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ان کے چچا کا ماتم کیا۔ اس کے بعد یہ ایک رسم بن گئی کہ جو کوئی کسی شہید کا ماتم کرنا چاہتا وہ پہلے حضرت حمزہؓ کے گھر جا کر ان کا ماتم کرتا۔

اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ گو اسلام ایک عام شخص کو موت پر گریہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا لیکن ایک شہید کے ماتم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک شہید شجاعت اور ولولے کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اس کے لیے آنسو بہانا اس کی شجاعت میں شرکت اس کی روح سے ہم آہنگی اور اس کے شوقِ شہادت سے موافقت کا حکم رکھتا ہے۔

سب سے پہلے سید الشہداء کا لقب حضرت حمزہؓ کو دیا گیا لیکن ۱۰ محرم ۶۱ھ ہجری کو امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد جس کے سامنے تمام شہادتیں ماند پڑ گئیں یہ لقب انھیں منتقل ہو گیا۔ بلا شبہ یہ لقب اب بھی حضرت حمزہؓ کے نام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے لیکن وہ اپنے زمانے کے سید الشہداء تھے جب کہ امام حسین علیہ السلام ہر دور کے لیے سید الشہداء ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ حضرت مریم عذرا اپنے وقت کی "سیدۃ النساء" تھیں جب کہ صدیقۂ کبریٰ حضرت فاطمہ زہراؑ ہر زمانے کے لیے "سیدۃ النساء" ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے پہلے جو بزرگوار شہید پر ماتم کے لیے مثال سمجھے جاتے تھے وہ حضرت حمزہؓ تھے۔ ان کے لیے آنسو بہانے کا مطلب شہید کی شجاعت میں شرکت، اس کی فداکاری کے جذبے سے موافقت اور اس کے شوقِ شہادت سے ہم آہنگی کا اظہار کرنا تھا۔ تاہم واقعۂ کربلا کے بعد یہ حیثیت امام حسین علیہ السلام کو منتقل ہو گئی۔

شہید کے ماتم کا فلسفہ

اس موقع پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مختصر طور پر شہید کے لیے گریہ و ماتم کے فلسفے پر روشنی ڈالیں۔

آجکل بہت سے لوگ امام حسین علیہ السلام کی خاطر رونے پر اعتراض کرتے

ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا کہنا ہے کہ یہ فعل غلط اندازِ فکر اور شہادت کے غلط تصور کا نتیجہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس رسم کے معاشرے پر منفی اثرات پیدا ہوئے ہیں اور جن قوموں نے اسے اپنایا ہے وہ کمزوری پسماندگی اور زوال کا شکار ہو گئی ہیں۔

(موجودہ کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ) مجھے یاد ہے کہ مقدس شہر قم میں (جو ایران میں اسلامی تعلیمات کا مرکز ہے) طالب علمی کے زمانے میں میں نے محمد مسعود کی تحریر کردہ ایک کتاب پڑھی جو اس وقت کا معروف مصنف تھا۔ اس کتاب میں مصنف (یعنی محمد مسعود) نے شیعوں کی امام حسینؑ کی غم گساری کی رسم اور عیسائیوں کے (ان کے عقیدے کے مطابق) حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا جشن منانے کا موازنہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں اس نے لکھا تھا:

"یہ بات توجّہ کے قابل ہے کہ ایک قوم اپنے شہید پر روتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک ناپسندیدہ اور افسوسناک چیز تصور کرتی ہے، جب کہ ایک اور قوم اپنے شہید کی موت پر جشن مناتی ہے کیونکہ وہ شہادت کو ایک بہت بڑا کارنامہ اور مایۂ افتخار سمجھتی ہے۔ ایک ایسی قوم جو ہزار سال سے روتی رہی ہو قدرتی طور پر اپنی قوتِ حیات کھو بیٹھتی ہے اور کمزور اور بزدل ہو جاتی ہے جب کہ وہ قوم جو ہزار دو ہزار سال سے اپنے ہیرو کی شہادت کا جشن مناتی ہو طاقتور شجاع اور فدا کار بن جاتی ہے۔ ایک قوم کے لیے شہادت کے معنی ناکامی کے ہیں۔ اس کا ردِّ عمل وہ رونے دھونے کی شکل میں ظاہر کرتی ہے جس کا نتیجہ کمزوری پستی اور محکومی ہے۔ جہاں تک

دوسری قوم کا تعلق ہے وہ شہادت کو فتح مندی سمجھتی ہے۔ اسی بنا پر وہ جشن مناتی ہے جو اس کے اعتمادِ نفس کو ابھارتا ہے۔"

یہ ہے خلاصہ محمد مسعود کی تنقید کا۔ یہی دلائل بعض دوسرے ناقدین نے بھی پیش کیے ہیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کا تجزیہ کریں اور ثابت کریں کہ عیسائیوں کا شہادت پر جشن منانا ان کی انفرادی سوچ کا نتیجہ ہے جب کہ مسلمانوں کا شہیدوں کی خاطر اشکبار ہونا ان کی اجتماعی سوچ کا مظہر ہے۔

بلاشبہ ہم اپنے ان عوام کے عمل کی توجیہ نہیں کر سکتے جو امام حسینؑ کو ایک ایسا شخص سمجھتے ہیں جس کے ساتھ بے حد ظلم ہوا اور جس کی جان رائیگاں چلی گئی وہ لوگ امام علیہ السلام کی شہادت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہیں لیکن آپ کے دلاورانہ اور قابلِ تحسین اقدام کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ ہم گزشتہ صفحات میں ایسے لوگوں کے طرزِ عمل پر تنقید کر چکے ہیں۔

ہم اس امر کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام نے شہیدوں کے لیے رونے کی کیوں تاکید کی ہے اور اس فعل کے پیچھے کونسا فلسفہ کارفرما ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہونے کا جشن منانے کی ابتدا کب اور کس شخص کے ہاتھوں ہوئی لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلام نے شہیدوں کے لیے رونے کی سفارش کی ہے اور کم از کم مذہبِ تشیّع کا یہ ایک مسلّمہ عقیدہ ہے۔

اب ہم اصل نکتے کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہم پہلے موت اور شہادت کے مسئلے کا انفرادی پہلو سے جائزہ لیں گے۔

کیا شہید کی موت متعلقہ شخص کا کارنامہ ہے اور اس کی کامیابی کی دلیل ہے؟ کیا دوسروں کو چاہیے کہ شہادت کو متعلقہ شخص کا ایک دلاورانہ فعل

قرار دیں؟

ہم جانتے ہیں کہ اس دارِ فانی میں بہت سے ایسے مکاتب فکر وجود میں آئے ہیں اور شاید ان میں سے کچھ اب بھی موجود ہوں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اور دنیا یا دوسرے الفاظ میں روح اور جسم کے درمیان تعلق کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسی کہ قیدی اور قیدخانے کے درمیان یا کنویں میں گرنے والے اور کنویں کے درمیان یا پرندے اور پنجرے کے درمیان تعلق کی ہوتی ہے۔

قدرتی طور پر ان مکاتب کے نزدیک موت کی حیثیت آزادی اور نجات کی ہے اسی بنا پر وہ خودکشی کی اجازت دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نبوت کے مشہور دعویدار مانی کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اس نظریے کے مطابق موت ایک مثبت قدر و قیمت رکھتی ہے اور ہر شخص کے لیے پسندیدہ چیز ہے۔ کسی کی موت بھی کوئی افسوسناک واقعہ نہیں قیدخانے سے آزادی، کنویں سے باہر نکل آنا اور پنجرہ توڑ کر اڑ جانا خوشی کی باتیں ہیں نہ کہ رنج و غم کی۔

ایک اور نظریہ یہ ہے کہ موت معدوم ہو جانا اور مٹ جانا ہے۔ جب کہ زندگی کے معنی وجود اور ہستی کے ہیں اور یہ واضح بلکہ فطری بات ہے کہ ہستی نیستی سے بہتر ہے اور زندگی خواہ کسی ہی شکل میں کیوں نہ ہو موت کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔

ایران کے مشہور صوفی شاعر مولانا روم نے معروف یونانی حکیم جالینوس سے منسوب کرتے ہوئے یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"میں زندگی کو ہر حالت اور ہر شکل میں موت پر ترجیح دیتا ہوں خواہ زندگی کی یہ شکل ہی کیوں نہ ہو کہ میرا سارا بدن ایک خچر کے پیٹ میں ہو اور فقط میرا سر سانس لینے کے لیے باہر نکلا ہوا ہو۔ اس نظریے

کے مطابق موت کی قدر و قیمت قطعی طور پر منفی ہے۔

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ موت کا مطلب نیست و نابود ہو جانا نہیں بلکہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو جانا ہے۔ اس نظریے کے مطابق انسان اور دنیا۔ رُوح اور بدن کا رشتہ، قیدی اور قید خانے اور کنویں میں گرے ہوئے آدمی اور کنویں اور پرندے اور پنجرے کے رشتوں کی مانند نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ رشتہ ایسا ہی ہے جیسا کہ طالب علم اور مدرسے کا یا کسان اور کھیت کا ہوتا ہے۔

یہ درست ہے کہ ایک طالب علم کو اکثر اپنے گھر سے دور ایک ایسی جگہ رہنا پڑتا ہے جہاں اسے دوستوں کی رفاقت میسّر نہیں آتی اور مدرسے کی چار دیواری میں رہ کر اسے اپنی تعلیم جاری رکھنی پڑتی ہے لیکن وہاں خوشگوار زندگی گزارنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا نصاب تعلیم کامیابی سے مکمل کر لے۔ یہ بھی درست ہے کہ ایک کسان کو اپنا گھر اور کنبہ چھوڑ کر کافی وقت کھیتوں میں گزارنا پڑتا ہے لیکن جو کام وہ وہاں انجام دیتا ہے اس کی بدولت اسے خود اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے لیے روزی میسّر آتی ہے اور وہ سارا سال آرام اور خوشحالی سے گزارتے ہیں۔

اس دنیا اور اگلی دنیا اور روح اور جسم کے مابین تعلق کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔ جو لوگ اس نظریے کے قائل ہوں لیکن اپنی سستی اور بد اعمالیوں کی وجہ سے عملی زندگی میں ناکام رہ جائیں انھیں موت واقعی ایک خوفناک چیز دکھائی دیتی ہے۔ دراصل وہ موت سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ انھیں اپنے اعمال کے نتائج سے خوف محسوس ہوتا ہے اس کے برعکس جو لوگ عملی زندگی میں کامیاب رہے ہوں ان کا اندازِ فکر اُس طالب علم جیسا ہوتا ہے جس نے اپنی تعلیم پر پوری توجہ دی ہو یا اُس کسان جیسا ہوتا ہے جس نے کھیتوں میں محنت سے کام کیا ہو۔ ایسے طالب علم اور کسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے گھر جائے لیکن وہ اپنا کام بھی ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا۔

اولیاء اللہ کامیاب طالب علموں کی مانند ہیں۔ انھیں موت کی شدید خواہش ہوتی ہے جس کا مطلب دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔

امام علی علیہ السلام نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے:

"اگر اللہ نے موت کا وقت مقرر نہ کر دیا ہوتا تو ان لوگوں کی روحیں ثواب کے شوق اور سزا کے خوف کی بنا پر ایک لمحے کے لیے بھی ان کے بدنوں میں نہ رہتیں!"

اس کے باوجود اولیاء اللہ موت کے پیچھے نہیں بھاگتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کام کرنا اور روحانی ارتقا کی منزلیں طے کرنا فقط اسی زندگی میں ممکن ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جتنا زیادہ جئیں گے اتنا ہی زیادہ کمال حاصل کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موت کا مقابلہ کرتے ہیں اور اللہ سے درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ ان دو باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ اولیاء اللہ کو موت مرغوب بھی ہے اور وہ اس کا مقابلہ بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے لمبی زندگی کی دعا مانگتے ہیں۔

یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے جنھیں اولیاء اللہ یعنی اللہ کے دوست ہونے کا دعویٰ تھا قرآنِ مجید فرماتا ہے:

"إِنْ زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ لِلَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ" (سورۃ الجمعہ۔ آیت ۶)

"اگر (جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو) تم اولیاء اللہ ہو تو موت تمھارے لیے پسندیدہ ہوتی اور تم اس کی تمنا کرتے۔"

پھر فرماتا ہے کہ وہ ہرگز موت نہیں چاہیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ

انھوں نے کیسے اعمال کیے ہیں اور آئندہ انھیں کیسی سزا ملے گی۔ ان لوگوں کا تعلق مذکورہ بالا گروہوں میں سے تیسرے گروہ سے ہے۔

دو صورتیں ایسی ہیں جن میں اولیاء اللہ درازیٔ عمر کی دعا نہیں مانگتے۔ ایک تو جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اطاعتِ الٰہی کی زیادہ توفیق میسر نہیں آرہی اور ترقی کی بجائے تنزل کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

امام علی ابن الحسین علیہم السلام فرمایا کرتے تھے:

إلٰهِيْ وَعَمِّرْنِيْ مَا دَامَ عُمْرِيْ بِذْلَةً فِيْ طَاعَتِكَ فَإِذَا كَانَ مَرْتَعًا لِلشَّيْطَانِ فَاقْبِضْنِيْ إلَيْكَ

"پروردگار! میری عمر اتنی لمبی کر جتنی تیری اطاعت میں صرف ہو سکے لیکن اگر وہ شیطان کی چراگاہ بن جائے تو مجھے جس قدر جلد ہو سکے اپنی طرف بلالے۔"

دوسری ایسی صورت شہادت کی ہے۔ اولیاء اللہ شہادت کی موت اللہ سے بلاشرط طلب کرتے ہیں کیونکہ شہادت میں نیک عمل اور تکامل دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ہم پہلے ایک حدیث نبویؐ نقل کر چکے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ شہادت بہترین نیکی ہے۔ علاوہ ازیں شہادت کے معنی دوسری دنیا میں منتقل ہونا ہے جس کا اولیاء اللہ کو بے حد اشتیاق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امام علی علیہ السلام کو محسوس ہوا کہ وہ شہادت کی موت مرنے والے ہیں تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

امام علی علیہ السلام نے زخمی ہونے اور داعیٔ اجل کو لبیک کہنے کے درمیانی عرصے میں بہت سی باتیں کہیں جو نہج البلاغہ سمیت کئی ایک کتابوں میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک جملے کا تعلق زیرِ بحث موضوع سے ہے۔ آپ نے فرمایا:

"وَاللهِ مَا فَجَأَنِي مِنَ الْمَوْتِ وَارِدٌ كَرِهْتُهُ وَلَا طَالِعٌ أَنْكَرْتُهُ وَمَا كُنْتُ إِلَّا كَقَارِبٍ وَرَدَ وَطَالِبٍ وَجَدَ"

"خدا کی قسم کوئی غیر متوقع یا ناپسندیدہ بات نہیں ہوئی۔ جو کچھ ہوا ہے وہ وہی ہے جس کی مجھے ایک عرصے سے خواہش تھی اور جس کے لیے میں دعائیں مانگا کرتا تھا۔ مجھے شہادت نصیب ہوئی ہے جس کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی کی تلاش میں ہو اور اچانک اُسے کوئی کنواں یا چشمہ مل جائے۔ میں اس شخص کی مانند ہوں جو کوئی چیز پانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہو اور بالآخر اُسے پالے۔"

۱۹ رمضان سنہ ۴۰ ہجری کو جب امام علی علیہ السلام کے قاتل نے فجر کے وقت اُن کے سر پر وار کیا تو پہلا یا دوسرا جملہ جو اُن کی زبان سے سُنا گیا وہ یہ تھا:

"فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ"

"ربِّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا"

پس اسلامی نقطۂ نگاہ سے جہاں تک خود شہید کا تعلق ہے شہادت ایک عظیم ترین کامیابی ہے ایک آرزو بلکہ سب سے بڑی آرزو ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"میرے جدِ بزرگوار نے مجھ سے فرمایا کہ تمھیں بارگاہِ خداوندی میں ایک عظیم مرتبہ ملنے والا ہے لیکن وہ مرتبہ شہادت کے بغیر نہیں مل سکتا"

پس امام حسینؑ کی شہادت خود اُن کے لیے ارتقاء اور تکامل کی آخری حد ہے۔

اب تک ہم نے موت اور شہادت کے انفرادی پہلو کا تجزیہ کیا ہے اور اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جہاں تک ایک شہید کا تعلق ہے شہادت کی موت ایک واقعی بہت بڑا

کارنامہ ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے موت بلاشبہ ایک مسرت انگیز واقعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک جیّد عالم سیّد بن طاؤس علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اگر ہمیں عزاداری کا حکم نہ دیا گیا ہوتا تو میں ائمہؑ کی شہادت کے دنوں میں جشن منانے کو ترجیح دیتا۔

اسی بنا پر ہم مسیحیت کے حضرت عیسیٰؑ کی شہادت کا جشن منانے کے فعل کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ اسلام بھی صریح طور پر شہادت کو شہید کا کارنامہ قرار دیتا ہے۔

لیکن اسلام کی نظر میں تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ جب ہم اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ شہادت ایک ایسا واقعہ ہے جو مخصوص حالات میں رُونما ہوتا ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد ایسے کئی واقعات رُونما ہوتے ہیں جن کی مناسب تشخیص ضروری ہے۔ اسی طرح شہادت سے معاشرے میں ایک ردِعمل پیدا ہوتا ہے جس کا انحصار محض شہید کی فتح یا شکست پر نہیں ہوتا بلکہ جو زیادہ تر لوگوں کی شہید اور اس کے مخالفین کے بارے میں آراء پر مبنی ہوتا ہے۔

شہید کا معاشرے سے دوہرا رشتہ ہے یعنی :

الف ـــــ ان لوگوں سے رشتہ کہ اگر وہ زندہ رہتا تو وہ اس کے وجود سے فائدہ اُٹھاتے اور اب اس فائدے سے محروم ہو گئے ہیں اور

ب ـــــ ان لوگوں سے رشتہ جنھوں نے اپنے فسق و فجور کے ذریعے ایسے حالات پیدا کر دیے جن کی بنا پر اُسے اُن کے خلاف قیام کرنا پڑا اور نتیجے میں اپنی جان قربان کر دی۔

ظاہر ہے کہ شہید کے پیروؤں کے نقطۂ نگاہ کے مطابق اُس کی موت ان

کے لیے ایک بہت رنجیدہ چیز ہے۔ جب وہ شہید کی شہادت پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں تو در حقیقت وہ اپنی بد نصیبی پر آنسو بہاتے ہیں۔

شہادت اس وقت پسندیدہ چیز ہوتی ہے جب حالات اس کا تقاضا کرتے ہوں۔ اس کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب حالات ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہوں۔ اس لحاظ سے یہ اس عمل جراحی سے مشابہ ہے جو اپنڈی سائٹس یا انتڑیوں کے زخم یا معدے کے زخم یا ایسی ہی کسی اور بیماری کی صورت میں ضروری ہو جاتا ہے اگر ایسی کوئی تکلیف نہ ہو تو ظاہر ہے کہ آپریشن کرنا غلط ہوگا۔

شہادت سے لوگوں کو جو سبق سیکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ان کے لیے لازم ہے کہ ایسی صورت حال دوبارہ نہ پیدا ہونے دیں۔ عزاداری کا مقصد اس سانحہ کو ایک ایسے واقعہ کے طور پر پیش کرنا ہوتا ہے جسے وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

جذبات کا اظہار ظالموں اور شہید کے قاتلوں کو ان کے وحشیانہ فعل پر لعنت ملامت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے کو ان مجرموں کے نقش قدم پر چلنے سے روکا جا سکے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں کا تعلق اس مکتب سے ہے جو امام حسینؑ کی خاطر عزاداری بپا کرتا ہے ان میں سے کوئی شخص یزید اور ابن زیاد وغیرہ سے رتی بھر مشابہت کا حامل ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔

ایک اور سبق جو معاشرے کو سیکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ جب کبھی حالات قربانی کا تقاضا کریں لوگوں کے لیے لازم ہے کہ شہید کے جذبات کو اپنے دلوں میں دوبارہ زندہ کریں اور اس کی قائم کردہ مثال پر برضا و رغبت عمل کریں۔ شہید کے لیے رونے کے معنی اس کی شجاعت میں شرکت، اس کی روح سے ہم آہنگی اور اس کے شوق شہادت سے موافقت کے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا

جشن، ناچ اور بعض اوقات عیاشی، شراب خوری اور بدمستی جو عیسائیوں کے مذہبی تہواروں میں دیکھنے میں آتی ہے شہادت کی رو سے زیادہ ہم آہنگ ہیں یا عزا داری۔

عموماً رونے کے بارے میں کچھ غلط فہمی پائی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ آنسو ہمیشہ درد اور پریشانی کی وجہ سے نکلتے ہیں اور خود رونا ایک ناپسندیدہ چیز ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

رونا اور ہنسنا انسان کی دو مخصوص خاصیتیں ہیں۔ دوسرے جانداروں کو بھی تکلیف اور راحت ہوتی ہے۔ وہ بھی خوش اور رنجیدہ ہوتے ہیں لیکن وہ نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں۔ ہنسی اور رونا شدید جذبات کے مظہر ہیں جو بنی نوع انسان کے لیے مخصوص ہیں۔

ہنسی کی کئی قسمیں ہیں لیکن یہاں ان کے بارے میں بحث کرنا مقصود نہیں۔ رونے کی بھی کئی قسمیں ہیں لیکن ان سب کا تعلق ایک قسم کی حساسیت اور ہیجان سے ہوتا ہے۔ ہم سب محبت اور عشق کے باعث بہنے والے آنسوؤں سے واقف ہیں۔ جب انسان محبت کی ہیجانی کیفیت کی بنا پر آنسو بہاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اپنے محبوب کے نزدیک تر محسوس کرتا ہے۔ ہنسی اور خوشی کی کیفیت زیادہ تر شخصی اور اپنے آپ میں محو ہو جانے کی ہے۔ جب کہ رونے کی کیفیت اپنے آپ سے باہر آ جانے اور اپنے آپ کو بھلا کر محبوب سے متحد ہو جانے کی ہے۔

اس نقطۂ نگاہ کے مطابق ہنسی شہوت کی مانند ہے جس کا مطلب اپنے آپ میں ڈوب جانا ہے اور رونا عشق کی مانند ہے جس سے مراد اپنے آپ سے باہر آنا ہے۔

اپنی بلند و بالا شخصیت اور دلاورانہ موت کے باعث امام حسینؑ لاکھوں

کروڑوں انسانوں کے دلوں میں شدید ترین جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اگر ہمارے مذہبی رہنما جذبات کا عظیم ذخیرہ عوام الناس کی روح کو امام علیہ السلام کی روح سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال کریں تو ساری دنیا کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

امام حسینؑ کے زندۂ جاوید ہو جانے کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ایک طرف تو ان کی تحریک منطق تھی اور معقولیت پر مبنی تھی اور دوسری طرف اس تحریک نے شدید جذبات کو ابھارا۔ ائمۂ اطہار نے امام حسینؑ کی خاطر رونے کی ہدایت دے کر بڑا حکیمانہ اقدام کیا ہے کیونکہ یہ رونے کا عمل ہی ہے جس نے امام علیہ السلام کی تحریک کو لوگوں کے دلوں میں مضبوطی سے نصب کر دیا ہے۔ ہم دوبارہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ کاش ہمارے ذاکرین کو یہ معلوم ہوتا کہ جذبات کے اس عظیم خزانے سے کس طرح استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(اقبالؒ)

شہید کی قبر

جب رسولِ اکرمؐ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کو وہ مشہور تسبیحات پڑھنے کو کہا جو عموماً نمازوں کے بعد یا سوتے وقت پڑھی جاتی ہیں:

(اَللّٰہُ اَکْبَرُ ۳۴ بار۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ۳۳ بار اور سُبْحَانَ اللّٰہِ ۳۳ بار)

تو وہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کی قبر پر گئیں اور تسبیح تیار کرنے کے لیے وہاں سے کچھ مٹی حاصل کی۔ ان کے اس فعل کی کیا اہمیت ہے؟ اس کی اہمیت یہ ہے

کہ شہید کی قبر متبرک ہے اور اس کے آس پاس کی مٹی بھی متبرک ہے۔
انسان کو تسبیحات پڑھنے کے لیے ایک تسبیح کی ضرورت ہوتی ہے اور اس مقصد کے لیے پتھر، لکڑی یا مٹی کی بنی ہوئی تسبیح استعمال کی جاسکتی ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تسبیح کس چیز کی ہے۔ پھر مٹی بھی کسی جگہ سے بھی لی جاسکتی ہے لیکن ہم شہید کی قبر کے پاس کی مٹی کو ترجیح دیتے ہیں۔ دراصل اس اقدام سے ہمارا مقصد شہید کی تعظیم بجا لانا ہوتا ہے۔
واقعۂ کربلا کے بعد سید الشہداء کا لقب حضرت حمزہؓ سے حضرت امام حسینؑ کو منتقل ہو گیا چنانچہ اب اگر کوئی شخص شہید کی قبر کی برکت سے مستفید ہونا چاہے تو اسے چاہیے کہ امام حسینؑ کے روضۂ مبارک کی مٹی سے تسبیح تیار کرے۔
ہمیں نمازیں ادا کرنی ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم اس بات کو بھی جائز نہیں سمجھتے کہ قالین یا ماکولات و ملبوسات پر سجدہ کریں لہٰذا ہم پتھر یا مٹی پر سجدہ کرتے ہیں۔
ائمہ اطہار علیہم السلام نے فرمایا ہے کہ ایک شہید کی قبر کے پاس سے لگی مٹی پر سجدہ کرنا بہتر ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس مقصد کے لیے کربلائے معلٰی کی مٹی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اس سے شہداء کی خوشبو آتی ہے۔ سجدہ کسی مٹی پر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اگر نمازی ایسی مٹی پر سجدہ کرے جس کا کچھ نہ کچھ تعلق شہیدوں سے ہو تو اسے سو گنا ثواب ملتا ہے۔
امام نے فرمایا ہے:
"میرے جدِ بزرگوار حسینؑ ابن علیؑ کی قبر کی خاک پر سجدہ کیا کرو۔ جب کوئی شخص اس متبرک مٹی پر سجدہ کرتا ہے تو وہ سات پردے چاک کر دیتا ہے۔"

امام علیہ السلام کے اس ارشاد کا مقصد لوگوں کو سمجھانا ہے کہ وہ شہید کی عظمت کو سمجھیں اور اس کی قبر کی مٹی پر سجدہ کریں کیونکہ ایسا کرنا نماز کی قدر و قیمت بڑھا دیتا ہے۔

شہید کی رات

موجودہ دور میں یہ رواج عام ہے کہ ہر سال کا ایک مخصوص دن لوگوں کے کسی مخصوص گروہ یا طبقے سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور اس دن ان سے اظہارِ عقیدت کیا جاتا ہے۔ ماؤں کا دن، اساتذہ کا دن، مزدوروں کا دن وغیرہ ایسے ہی دن ہیں۔ تاہم مسلمانوں کے علاوہ کوئی قوم "شہید کا دن" نہیں مناتی۔ مسلمان شہیدوں کا جو دن مناتے ہیں وہ عاشورا ہے لہٰذا اس کی رات کو "شہید کی رات" کہا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ شہید کی منطق ایک طرف عشقِ الٰہی اور دوسری طرف اصلاحِ اجتماعی کی منطق ہے۔ اگر مصلح اور عارف کی شخصیتوں کو جمع کر دیا جائے اور اس سے ایک انسان بنایا جائے تو شہید وجود میں آتا ہے۔ اس طرح ایک مسلم بن عوسجہ، ایک حبیبؓ ابن مظاہر اور ایک زہیرؓ بن قین وجود میں آتا ہے تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ تمام شہیدوں کا رتبہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔

شہید ساتھیوں پر فخر

امام حسینؑ نے شہدائے عاشورا کے بارے میں ایک گواہی دی ہے جس سے ان کا مقام اور مرتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں صالح اور پاکباز لوگوں میں شہدا ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں اور امام حسینؑ کے ساتھیوں کو شہدا میں ایک

امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ امام حسینؑ کی گواہی کیا تھی؟ اگرچہ امامؑ نے اپنے ساتھیوں کو پہلے ہی چھان لیا تھا اور جو لوگ مطلوبہ معیار پر پورے نہیں اُترے تھے وہ چلے گئے تھے۔ اس طرح جو قابلِ اعتماد ساتھی رہ گئے تھے، امامؑ نے شبِ عاشور انھیں آخری دفعہ آزمایا اور اس دفعہ کسی کو بھی رد نہیں کیا گیا۔

شبِ عاشور امامؑ نے کیا کیا؟

فَجَمَعَ اَصْحَابَہٗ " عِنْدَ قُرْبِ الْمَاءِ " یا عِنْدَ قُرْبِ الْمَسَاءِ (یہ روایت دو طرح سے آئی ہے)

جو لوگ عِنْدَ قُرْبِ الْمَاءِ والا جملہ نقل کرتے ہیں ان کے مطابق امام حسینؑ نے روزِ اول ہی سے ایک خیمہ پانی کے لیے مختص کر رکھا تھا جس میں پانی سے بھری ہوئی مشکیں رکھی جاتی تھیں اور اس خیمے کو "خیمۂ قرب الماء" (پانی والا خیمہ) کہا جاتا تھا۔ آپؑ نے اپنے سب ساتھیوں کو اس خیمہ میں جمع کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپؑ نے اس مقصد کے لیے اس خیمے کا انتخاب کیوں کیا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شبِ عاشور اُس خیمے میں پانی سے بھری ہوئی ایک بھی مشک موجود نہ تھی۔ اگر وہاں کوئی پانی ہو سکتا تھا تو وہ وہی ہوگا جو امام حسینؑ کے فرزندِ ارجمند حضرت علی اکبرؑ دریائے فرات سے بھر کر لائے تھے۔

سانحۂ کربلا کے معتبر راویوں کا کہنا ہے کہ شبِ عاشور امام حسینؑ نے اپنے بیٹے علی اکبرؑ کو ایک دستے کے ساتھ پانی لانے بھیجا اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا لایا ہوا پانی سب نے پیا۔ پھر آپ نے فرمایا:

"اس پانی سے غسل بھی کر لو اور نہا دھو لو کیونکہ دنیا کے پانی میں سے یہ تمھارا آخری حصہ ہے۔"

اور اگر جملہ "عند قرب المساء" ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ

آپ نے اپنے اصحاب کو مغرب کے وقت جمع کیا۔

بہرحال امام علیہ السّلام نے اپنے سب ساتھیوں کو جمع کیا اور انھیں کہا کہ اگر وہ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ آپ نے ایک بلیغ اور پُر زور خطبہ ارشاد فرمایا۔ اِس خطبے میں آپ نے اُس دن سہ پہر کو جو واقعہ رونما ہوا تھا اُس کا ذکر بھی کیا۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا دشمن نے ۹ محرم کی شام کو اپنا آخری الٹی میٹم دیا تھا جس کے مطابق امام علیہ السلام کو یوم عاشورا کی صبح تک اپنا قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ امام زین العابدین علیہ السّلام جو خود وہاں موجود تھے فرماتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو ایک خیمے میں جمع کیا جو اس خیمے سے متصل تھا جس میں وہ (امام زین العابدینؑ) بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے اور ایک خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"اُثْنِیْ عَلَی اللّٰہِ اَحْسَنَ الثَّنَآءِ وَ اَحْمَدُہٗ عَلَی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَحْمَدُکَ عَلٰی اَنْ اَکْرَمْتَنَا بِالنُّبُوَّۃِ وَعَلَّمْتَنَا الْقُرْاٰنَ وَفَقَّھْتَنَا فِی الدِّیْنِ"

"میں بہترین طریقے سے خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں عافیت اور مصیبت دونوں میں اُس کی حمد کرتا ہوں۔ خدایا میں تیرا شکرگزار ہوں کہ تو نے ہمیں پیغمبری کی نعمت سے نوازا، ہمیں قرآن سکھایا، ہمیں دین اور اس کے احکام کی سمجھ عطا کی"

جو شخص حق اور حقیقت کے راستے پر گامزن ہو اُسے جو حالات بھی پیش آئیں اُس کے لیے خیر کا حکم رکھتے ہیں۔ ایک حق پرست انسان ہر حال میں اپنا مخصوص فریضہ پہچانتا ہے اور اس کی ادائیگی میں اُسے جو کچھ بھی برداشت کرنا پڑے وہ شر نہیں ہے۔

اِس سلسلے میں امام حسین علیہ السّلام نے معروف شاعر فرزدق کو جس

سے آپ کی ملاقات کربلا جاتے ہوئے ہوئی بڑا دلکش جواب دیا۔ فرزدق نے امامؑ کو عراق کے خطرناک حالات سے آگاہ کیا۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

"اِنْ نَزَلَ الْقَضَآءُ بِمَا نُحِبُّ نَحْمَدُ اللّٰہَ عَلٰی نَعْمَآئِہٖ وَھُوَ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی اَدَآءِ الشُّکْرِ وَاِنْ حَالَ الْقَضَآءُ دُوْنَ الرَّجَآءِ فَلَمْ یَتَعَدَّ (فَلَمْ یَبْعُدْ) مَنْ کَانَ الْحَقُّ نِیَّتَہٗ وَالتَّقْوٰی سَرِیْرَتَہٗ"

"اگر حالات نے ہماری خواہش کے مطابق رُخ اختیار کیا تو ہم اللہ کی حمد و ثنا کریں گے اور اس کا شکر ادا کرنے کے لیے اس سے مدد چاہیں گے اور اگر حالات مساعد نہ ہوئے تب بھی ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے کیونکہ ہماری نیت نیک ہے اور ہمارا ضمیر صاف ہے۔ پس جو کچھ بھی پیش آئے وہ خیر ہے شر نہیں۔ ہم تمام حالات میں خواہ وہ خوشگوار ہوں یا نہ ہوں، اللہ کے شکر گزار ہیں"

امام علیہ السلام کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں اچھے برے دونوں قسم کے دن دیکھ رکھے ہیں۔ اچھے دن وہ تھے جب میں رسولِ اکرمؐ کی گود میں بیٹھتا تھا اور ان کے کندھوں پر سوار ہوتا تھا۔ ایک وقت وہ تھا جب میں اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ چہیتا بچہ تھا۔ ان دنوں کے لیے میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ میں موجودہ مشکلات کے لیے بھی اس کا شکر گزار ہوں کیونکہ میں انھیں برا نہیں سمجھتا بلکہ خیر سمجھتا ہوں۔

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں اور اپنے اہلِ بیتؑ کے بارے میں تاریخی گواہی دی۔ آپ نے فرمایا:

"اِنِّیْ لَآ اَعْلَمُ اَصْحَابًا خَیْرًا وَّلَآ اَوْفٰی مِنْ اَصْحَابِیْ

وَلَا اَهْلَ بَيْتٍ اَبَرَّ وَلَا اَوْصَلَ وَلَا اَفْضَلَ مِنْ اَهْلِ بَيْتِي"۔

"مجھے اپنے اصحاب سے بہتر اور زیادہ وفادار کسی اصحاب کا علم نہیں اور نہ ہی میں کوئی اعزہ واقربا جانتا ہوں جو میرے اعزہ واقربا سے زیادہ نیک اور زیادہ فرض شناس ہوں"۔

یہ فرما کر آپ نے اپنے ساتھیوں کو رسولِ اکرمؐ کے اُن صحابہ سے افضل قرار دیا جو آنحضرتؐ کے ہمراہ جنگوں میں شریک ہوئے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے اور انھیں اپنے والد بزرگوار امام علیؑ کے ان ساتھیوں سے بھی افضل قرار دیا جنھوں نے جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا کیونکہ آپ کے ساتھیوں کے حالات ان لوگوں سے زیادہ سخت تھے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے کسی ایسے اعزہ واقربا کا علم نہیں جو میرے اعزہ و اقربا سے زیادہ نیک اور فرض شناس ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنے اعزہ کے بلند مقام اور رتبے کا اعتراف کیا اور اُن کا شکریہ ادا کیا۔

پھر آپ نے فرمایا:

"حاضرین! میں اپنے ساتھیوں اور عزیزوں سمیت آپ سب کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں (دشمن کی افواج) کو میرے علاوہ کسی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ مجھے اپنا واحد دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ مجھ سے بیعت لینا چاہتے ہیں۔ اگر میں نہ رہوں تو یہ تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ تم نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ اب میں تمھیں تمھارے عہد سے آزاد کرتا ہوں۔ تم ہرگز یہاں رہنے کے پابند نہیں ہو۔ تمھیں کوئی دوست یا دشمن مجبور نہیں کر رہا۔ تم قطعاً آزاد ہو۔ تم میں سے جو کوئی جانا

چاہے جا سکتا ہے!!

پھر آپ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

• تم لوگ میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑو اور چلے جاؤ۔"

امام حسین علیہ السلام کے اعزّہ میں چھوٹے بڑے دونوں قسم کے لوگ شامل تھے۔ علاوہ ازیں وہ یہاں اجنبی تھے۔ لہٰذا امام علیہ السلام یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سب کے سب اکٹھے روانہ ہو جائیں۔ اسی لیے آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ان میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑیں اور میدانِ جنگ سے نکل جائیں۔

یہ واقعہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں کے بلند کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ انھیں کسی قسم کی کوئی مجبوری نہ تھی۔ دشمن کو ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ امام علیہ السلام نے انھیں ان کی ذمّے داری سے آزاد کر دیا تھا۔ ان حالات میں جو ایمان افروز جوابات امام حسینؑ کے اصحاب اور اعزّہ نے فرداً فرداً آپ کو دیے وہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے کچھ اقتباسات نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

شہید کی شجاعت

روزِ عاشور اور شبِ عاشور امام حسینؑ یہ دیکھ کر بڑی خوشی محسوس کر رہے تھے کہ سب سے کم سن بچّے سے لے کر سب سے سن رسیدہ شخص تک آپ کے سب اقربا آپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

آپ کے لیے ایک اور مسرت انگیز چیز یہ تھی کہ آپ کے کسی ساتھی نے بھی رتّی بھر کمزوری کا اظہار نہیں کیا۔ ان میں سے کوئی بھی آپ کو چھوڑ کر دشمنوں سے نہیں جا ملا۔ اس کے برعکس وہ کئی ایک مخالفین کو اپنی طرف لے آئے۔ ایسے لوگ عاشور کے دن اور اس سے پہلی رات کو آ کر ان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔

انھیں میں ایک حُرؓ بن یزید ریاحی تھے۔

شبِ عاشور جو لوگ آ کر امامؑ کے ساتھیوں میں شامل ہوئے اُن کی تعداد تیس تھی۔ یہ چیز امام علیہ السّلام کے لیے بڑی اطمینان بخش تھی۔

امام حسینؑ کے ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے آپ سے عرض کیا:

"آقا! کیا آپ ہمیں اجازت دے رہے ہیں کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں؟ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے مقابلے میں ہماری زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔"

اُن میں سے ایک نے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ میں مارا جاؤں اور میرا بدن جلا کر میری راکھ بکھیر دی جائے اور یہ عمل آپ کی خاطر ستر بار دہرایا جائے۔ ایک بار قتل ہونا تو کوئی چیز ہی نہیں۔"

ایک اور نے کہا:

"میں چاہتا ہوں کہ میں مسلسل ہزار دفعہ قتل کیا جاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری ہزار جانیں ہوتیں جنھیں میں آپ پر نچھاور کر دیتا۔"

پہلے شخص جنھوں نے یہ الفاظ کہے امامؑ کے دلاور بھائی حضرت ابوالفضل العباسؑ تھے۔ ان کے بعد باقی سب نے اسی طرح کے جملے دہرائے۔

نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے
یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

یہ اُن کی آخری آزمائش تھی۔ جب سبھی اپنے فیصلے کا اظہار کر چکے تو امام حسین علیہ السّلام نے انھیں بتایا کہ دوسرے دن کیا ہونے والا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ کل تم سب شہید ہو جاؤ گے۔"

ان سب نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ انھیں اس بات کا موقع مل رہا ہے کہ دوسرے دن فرزندِ رسولؐ کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

یہاں کچھ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اگر سوال شہید کی منطق کا نہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں کا کربلا میں ٹھہرنا بیکار تھا۔ اگر امام حسینؑ کو بہرحال قتل ہونا ہی تھا تو ان لوگوں کو جانیں قربان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ حضرات کیوں وہاں ٹھہرے رہے؟ امام حسینؑ نے انھیں ٹھہرنے کی اجازت کیوں دی؟ انھیں کیوں مجبور نہ کیا گیا کہ وہ چلے جائیں؟ انھیں کیوں نہ کہا کہ کسی کو تم سے سروکار نہیں اور تمھارے یہاں ٹھہرنے کا تمھیں بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا واحد نتیجہ یہ ہوگا کہ تم بھی اپنی جانیں گنوا بیٹھو گے لہٰذا تمھیں چلے جانا چاہیے۔ تمھارا جانا واجب ہے اور یہاں رکنا حرام ہے۔ اگر ہم جیسا کوئی شخص امام حسینؑ کی جگہ ہوتا اور شرع کی مسند پر بیٹھا ہوتا اور قلم اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ لکھتا کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ تمھارا یہاں مزید رکنا حرام اور جانا واجب ہے اور اگر تم یہاں ٹھہرے رہے تو اس گھڑی کے بعد تمھارا سفر گناہ ہوگا اور تمھیں قصر کی بجائے پوری نماز پڑھنی چاہیے۔

لیکن امام حسینؑ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ اس کے برعکس انھوں نے ان لوگوں کی جانیں قربان کر دینے پر آمادگی کا خیر مقدم کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شہید کی منطق دوسرے لوگوں کی منطق سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک حق پرست مجاہد اپنی جان کی قربانی اس لیے دیتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا کر سکے۔ معاشرے کو روشن خیال بنا سکے۔ اس میں نئے سرے سے جان ڈال سکے اور اس کے بدن میں تازہ خون داخل کر سکے۔ یہ ایک ایسا ہی موقع تھا۔

شہادت کا واحد مقصد دشمن کو شکست دینا نہیں ہوتا۔ یہ جوش و خروش

بھی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اگر اس دن امام حسینؑ کے ساتھی اپنی جانیں نثار نہ کر دیتے تو اس قدر جوش و خروش کیسے پیدا ہو سکتا تھا؟ گو شہادت کے اس واقعہ میں امام حسین علیہ السلام مرکزی شخصیت کے حامل تھے لیکن ان کے ساتھیوں کی شہادت نے خود ان کی شہادت کی شان و شوکت اور وقار میں اضافہ کیا۔ ممکن تھا کہ ان کی شرکت کے بغیر امام حسینؑ کی شہادت کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی کہ لوگ اس سے متاثر ہوں اس سے سبق سیکھیں اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک جوش اور ولولے سے سرشار رہیں۔

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ کے بے پایاں لطف و کرم میں پناہ ڈھونڈتے ہیں اور آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ دعا کریں کہ وہ پروردگار عالم ہم سب کو توفیق دے کہ ہم اپنی خواہشات کو اس کی مرضی کے تابع کر دیں اور ہم پر اپنی برکتیں نازل کرے اور اپنی راہ میں شہادت کا رتبہ بخشے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ

(سورۃ الشعراء۔ آیت ۲۲۷)

ضمیمہ



شعار اسلام

اس سے پیشتر کہ شعارِ اسلامی کے متعلق کچھ کہا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "شعار" کی وضاحت کی جائے اور اس کے معنی بیان کیے جائیں۔

درحقیقت شعار، سے مراد اشعار یا نثر میں ادا کیے گئے وہ کلمات ہیں جو میدانِ جنگ میں اُترنے والے اشخاص پڑھا کرتے تھے۔ ہر گروہ کا ایک مخصوص شعار ہوتا تھا۔ لڑائی عموماً دو اشخاص کے درمیان ہوتی تھی۔ جو دو گروہ آپس میں لڑتے تھے ان کے افراد دن رات مسلح رہتے تھے۔ وہ سب کے سب خود، زرہ اور فوجی جوتے پہنے ہوتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں تلوار، نیزہ اور سپر ہوتی تھی اور اُن کے چہرے ناک تک ڈھکے ہوتے تھے۔ ایک سپاہی کی فقط آنکھیں کھلی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ میدانِ جنگ میں یہ پہچاننا مشکل ہوتا تھا کہ یہ شخص کون ہے۔

عام حالات میں ہر شخص کا سر اور گردن کھلی ہوتی ہے اور وہ مخصوص لباس

پہنے ہوتا ہے۔ لوگوں کے لباس مختلف ہوتے ہیں اور انھیں دُور سے پہچانا جاسکتا ہے۔ لیکن لڑائیوں میں لوگوں کے متعدد اور ہم شکل ہونے کی وجہ سے خود ایک فوج کے افراد کو پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص دشمن کے سپاہی پر حملہ کرنے کی بجائے خود اپنے ایک ساتھی کا خاتمہ کر دیتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ ہر گروہ میں ہر قوم اور ہر فوج کا ایک مخصوص شعار ہوتا تھا ایک جملے کا انتخاب کر لیا جاتا تھا اور جنگ کے وقت یہ جملہ اکثر دہرایا جاتا تھا اور نعرے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا تاکہ یہ پتا چلتا رہے کہ اس سپاہی کا تعلق فوج 'الف' سے ہے۔ اسی طرح دوسرے فریق کا ایک شعار ہوتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس نعرہ لگانے والے کا تعلق فوج 'ب' سے ہے۔ اس کا کم از کم یہ فائدہ ہوتا تھا کہ فوج کے افراد غلطی نہیں کھاتے تھے اور اپنے ہی ساتھیوں کو نہیں مار ڈالتے تھے۔

بعض اوقات جو نعرہ لگایا جاتا وہ اس سے بھی بلند تر اور زیادہ واضح ہوتا تھا اور وہ یوں کہ جو سپاہی میدانِ جنگ میں جاتا وہ اپنے گروہ کا مخصوص نعرہ لگانے کے ساتھ ساتھ اکثر خود اپنا تعارف بھی کراتا تھا۔

عربوں میں چونکہ شعر کہنے کا ملکہ زیادہ ہوتا ہے (اس قوم کے لیے شعر کہنا معمولی بات ہے) اور یہ عربی زبان کی خصوصیات میں سے ہے اس لیے ان میں سے اکثر لوگ جب میدانِ جنگ میں آتے تو ایک رباعی یا ایک رجز کے ذریعے اپنا تعارف کراتے تھے۔ مثلاً جو شخص اپنا مدِ مقابل طلب کرتا تھا وہ یہ مطالبہ ایک شعر میں کرتا تھا اور جو شخص جواب میں کہتا تھا کہ میں مقابلے کے لیے تیار ہوں وہ بھی بعض اوقات اسی کی لَے میں شعر کہہ کر اپنی آمادگی کا اظہار کرتا تھا گو اسی قافیہ میں فی البدیہہ جواب دینا کافی مشکل کام ہے۔

جنگِ خندق کا شعار

جنگِ خندق کے موقع پر رسولِ اکرمؐ نے حکم دیا کہ مدینہ کے اردگرد ایک خندق کھود دی جائے تاکہ دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکے تاہم چند اشخاص نے جو گھوڑوں پر سوار تھے ایک ایسی جگہ سے خندق عبور کر لی جہاں اس کی چوڑائی ذرا کم تھی۔ انھیں میں ایک مشہور جنگجو عمرو بن عبدود تھا جو معروت کے لقب سے مشہور تھا۔ وہ خندق عبور کر کے مسلمانوں کے بالمقابل آگیا اور آواز دی:

"ہے کوئی مرد جو میرے مقابلے پر آئے؟"

عمرو بن عبدوُد کو سبھی مسلمان جانتے تھے اور ان کے دلوں میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اس کے مقابلے پر جانا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے لہٰذا کسی نے اس کو جواب دینے کی جراٴت نہ کی بجز ایک نوجوان کے جو اپنی جگہ سے اٹھا اور رسولِ اکرمؐ سے مخاطب ہو کر گویا ہوا:

"یا رسولؐ اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کے مقابلے پر جاؤں۔"

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا:

"تم بیٹھ جاؤ۔"

یہ نوجوان ابوطالب کا شجاع فرزند علیؑ تھا۔

عمرو بن عبدود نے پھر للکارا:

"ہے کوئی مرد جو میرے مقابلے پر آئے؟"

اس دفعہ بھی امام علی علیہ السلام کے علاوہ کوئی نہ اٹھا۔ مسلمانوں کی آبرو داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ عمر بن الخطاب نے اُن کی طرف سے ان الفاظ میں عذر خواہی کی:

"یا رسول اللہ! اگر کوئی مسلمان مقابلے کے لیے نہیں اٹھتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس شخص کا مقابلہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ ایک دفعہ میں اور یہ۔ دونوں ایک قافلے میں شامل تھے۔ راستے میں ڈاکوؤں کے ایک بہت بڑے گروہ سے آمنا سامنا ہو گیا اور اس شخص نے ایک اونٹ کے بچے کو ڈھال بنا کر تنِ تنہا ان کا مقابلہ کیا۔ اس سے لڑنے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟"

آخر کار مسلمانوں کو خوب ذلیل کرنے کے لیے عمرو نے یہ شعر پڑھا:

بَحَحْتُ مِنَ النِّدَآءِ بِجَمْعِکُمْ هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ
وَوَقَفْتُ اِذْ جَبُنَ الْمُشَجِّعُ مَوْقِفَ الْبَطَلِ النَّاجِزِ

(میں تھک گیا ہوں اور میرا گلا دکھنے لگا ہے۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ کوئی مرد ہے تو میرے مقابلے پر آئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے درمیان کوئی مرد نہیں ہے)

رسول اکرمؐ نے امام علیؑ کو مقابلے پر جانے کی اجازت دے دی۔ امام علیؑ اپنی جگہ سے اُٹھے اور فرمایا:

وَلَقَدْ عَطَاکَ مُجِیْبُ صَوْتِکَ غَیْرُ عَاجِزٍ

(تیری للکار کا جواب وہ دے گا جو عاجز نہیں)

آپ نے اسی لَے میں مصرعہ پڑھا۔ آگے بڑھے اور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ حالات نے کچھ ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"کُلِّ ایمان کُلِّ کفر کے مقابلے پر جا رہا ہے"

یعنی یہ ایک ایسا مقابلہ ہے جس کے نتیجے میں اسلام اور کفر کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے گا۔

عاشورا کا شعار

جو چیزیں معرکۂ کربلا میں زیادہ تر دیکھنے میں آتی ہیں ان میں ایک شعار کا مسئلہ ہے یعنی امام حسین علیہ السلام کے اصحاب کا شعار اور خود امامؑ کا اور اُن کے خاندان کا شعار۔ یہ وہ شعار ہیں جن میں ایک رباعی پر مشتمل ایک رجز کے ذریعے اپنا تعارف کرانے کے علاوہ ایسے جملے کہے گئے ہیں جن میں ان بزرگواروں نے اپنی تحریک پر روشنی ڈالی ہے بالخصوص جو کچھ امام حسینؑ نے فرمایا ہے وہ بڑی اہم چیز ہے۔

تاریخ میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض اوقات جب لوگ کسی مقصد کی خاطر ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو یکلخت انھیں پتا چلتا ہے کہ باہر یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ اس اجتماع کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ ایران میں دستوری حکومت کے قیام کے ابتدائی دنوں میں ایسی باتیں بہت سننے میں آتی تھیں۔ لوگوں کو جنھیں کسی بات کا علم نہیں ہوتا تھا کسی اور بہانے سے ایک جگہ جمع کیا جاتا تھا اور جب وہ منتشر ہو جاتے تھے تو بات کچھ اور ہی ثابت ہوتی تھی۔ لوگوں میں اتنا شعور نہیں تھا کہ وہ خود سمجھ سکیں کہ وہ کیوں اکٹھے ہوئے ہیں اور اس اجتماع کا مقصد کیا ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے عاشورا کے دن بہت سے شعار دیے ہیں اور ان میں اپنی تحریک کی حقیقت کی وضاحت کی ہے۔ یعنی ہم کیوں لڑ رہے ہیں۔ کس بنا پر یزید کی اطاعت قبول نہیں کرتے اور کیوں یہاں آئے ہیں تاکہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم اہلِ تشیع نے وہ شعار بھلا دیے ہیں اور ان کی جگہ کچھ ایسے شعار رکھ دیے ہیں جن سے امام حسین علیہ السلام کی تحریک کی عکاسی نہیں ہوتی۔

ہمارے امام یکے بعد دیگرے تشریف لائے اور انھوں نے ہدایت کی کہ

عاشورا کو بھلانہ دیا جائے بلکہ اس قیمتی سرمایہ کی حفاظت کی جائے۔

امام حسینؑ کی تحریک فراموش نہیں ہونی چاہیے۔ یہ مکتب زندہ رہنا چاہیے۔ عاشورا اہل تشیّع کا شعار بن گیا ہے۔

جب ایک سنی، عیسائی، یہودی اور لامذہب شخص سامنے آکر یہ کہے کہ تم نویں اور دسویں محرم کو جمع ہوتے ہو۔ تمام کام کاج بند کر دیتے ہو۔ مسجدوں میں اکٹھے ہوتے ہو، ماتمی دستے تیار کرتے ہو، سینہ کوبی کرتے ہو، زنجیروں سے ماتم کرتے ہو اور گریہ وزاری کرتے ہو اس سے تمھارا مقصد کیا ہے اور تم کہنا کیا چاہتے ہو تو آپ کو بتانا چاہیے کہ ہماری گفتار، ہمارا مقصد اور ہمارا نالہ و فریاد کیا چیزیں ہیں۔ امام حسینؑ فقط اس لیے نہیں آئے تھے کہ لڑتے ہوئے قتل ہو جائیں اور جو کہنا چاہیں وہ نہ کہیں۔ انھیں جو کچھ کہنا تھا انھوں نے کہا اور اپنے مقصد کی وضاحت کر دی۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ عاشورا کے دن امام حسینؑ کے شعار کیا تھے۔ یہی شعار تھے جنھوں نے اسلام کو اور تشیّع کو زندہ کیا۔ انھیں شعار نے اموی خلافت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور جس کے نتیجے میں حکومت بنی عباس کے ہاتھوں میں آگئی۔ اگر امام حسینؑ کی تحریک نہ ہوتی تو اموی جماعت جو عبداللہ علائلی اور بعض دوسرے افراد کے قول کے مطابق ایک ایسی جماعت تھی جو اسلامی ممالک کی قسمت پر مسلط ہونے کا پروگرام لے کر آئی تھی شاید ہزار سال تک حکومت کرتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا مقصد کیا ہوتا؟ اس کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو اسلام سے پہلے والی حالت پر لوٹا دے اور جاہلیت کو از سر نو زندہ کرے اور یہ سب کچھ اسلام کے پردے میں کرے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کے شعار نے ان تمام پردوں کو چاک کر کے حقیقت

واضح کردی اور ان کے منصوبوں کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا۔

لہٰذا عاشورا میں ہم دو قسم کے شعار دیکھتے ہیں۔ ایک شعار تو وہ ہے جو فقط شخصیت کا تعارف کراتا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں لیکن کچھ شعار ایسے ہیں جو شخصیت کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ خیالات، احساسات اور نظریات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور یہ شعار عاشورا کے دن زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں۔

فخر کا شعار

امام حسینؑ نے عاشورا کے دن جو شعار دیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ انھوں نے امام علیؑ ابن ابی طالب کا فرزند ہونے پر بے حد فخر کیا۔ اگرچہ جو لوگ وہاں آپ کے مقابلے پر آئے ہوئے تھے وہ امام علیؑ کے دشمن تھے لیکن وہ رسولِ اکرمؐ کی امت ہونے کے دعویدار تھے۔ تاہم امام حسینؑ کی کوشش یہ تھی کہ امام علیؑ کے حوالے سے اپنی حیثیت پر فخر کریں۔ عاشورا کے دن جو اشعار مختلف انداز میں پڑھے گئے ان میں سے کچھ خود امام حسینؑ کے اور کچھ دوسرے لوگوں کے تھے (مثلاً امام نے "فروہ بن مسیک" کے جو اشعار عاشورا کے دن پڑھے وہ سراپا رزمیہ تھے) آپ جو اشعار پڑھ رہے تھے اور انھیں اپنا شعار قرار دیا تھا ان میں سے ایک شعر یہ تھا:

اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰی مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

موت ذلت سے بہتر ہے۔ موت ہمیشہ ذلت اور رسوائی
کی ندامت سے بہتر، زیادہ عزیز اور زیادہ محبوب ہوتی ہے

یہ وہ شعار ہے جسے آزادی، عزت اور شرافت کے شعار کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک سچے مسلمان کے لیے موت سے ہم کنار ہونا ذلت کا بوجھ اٹھانے کے مقابلے میں ہمیشہ بہتر اور خوش آئند ہوتا ہے۔

اے دنیا کے لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ اگر امام حسین علیہ السلام اپنے اور اپنے ساتھیوں کے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے کے لیے تیار ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ انھوں نے خود اس کی یہ وضاحت کی ہے:

امام حسینؑ نے رسول اکرمؐ اور امام علیؑ کے زیر سایہ تربیت پائی تھی۔ انھوں نے سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراءؑ جیسی ماں کا دودھ پیا تھا۔

امام حسینؑ نے عاشورا کے دن ایک خطبہ دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں اور اگر امام حسینؑ کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو ہمت ہار جاتا لیکن یہ خطبہ جوش و خروش اور احساسات سے اس قدر لبریز ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا آپ کا دہن مبارک شعلے اگل رہا ہے۔ امامؑ نے عبید اللہ ابن زیاد کے بارے میں یہ جملے مذاق مذاق میں نہیں کہے:

أَلَا وَإِنَّ الدَّعِيَّ ابْنَ الدَّعِيِّ قَدْ رَكَزَنِي
بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ
وَهَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ۔

ھیھات منا الذلۃ کے جملے سے کیا مراد ہے؟

زیاد کے بیٹے کو جس کی تلوار کی دھار سے خون ٹپک رہا تھا اور جس کے ظالم باپ نے بیس سال پیشتر اپنے ظلم و ستم سے کوفہ کے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا تھا کوفے کا حاکم مقرر کیا گیا۔ آپ نے دیکھا کہ جب لوگوں نے یہ خبر سنی تو خوف کے مارے اپنے گھروں میں گھس گئے کیونکہ وہ اُسے اس کے ظالم اجداد کے حوالے

سے پہچانتے تھے۔

آپ نے دیکھا کہ چونکہ لوگوں کو عبیداللہ ابن زیاد اور اس سے پہلے اس کے باپ کی حکومت کی سختی کا تجربہ تھا، اس لیے جیسے ہی ابن زیاد نے کوفہ کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لیا ان کا رویہ بدل گیا۔ خیالات تبدیل ہوگئے۔ پہلے ان کی نظر میں مسائل کا معیار کچھ اور تھا اور اب کچھ ہوگیا۔ پہلے وہ جہاد کا دم بھرتے تھے اب وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۵) کا دم بھرنے لگے۔ پہلے اسلام پیارا تھا اب جان پیاری ہونے لگی بالآخر وہ مسلمؓ بن عقیل کا ساتھ چھوڑ گئے لیکن امام حسینؑ کو اسلام اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا وہ کسی کے رُعب میں آنے والے نہ تھے۔ انھوں نے بڑی جرأت سے کہا:

أَلَا وَأَنَّ الدَّعِيَّ ابْنَ الدَّعِيِّ

"اے لوگو! تمھارا یہ امیر اور حاکم حرامزادے باپ کا حرامزادہ بیٹا ہے۔"

• قَدْ رَكَزَنِي بَيْنَ اثْنَتَيْنِ بَيْنَ السِّلَّةِ وَالذِّلَّةِ"

دیکھو وہ کس طرح مجھے یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ اے حسین! یا تو تمھیں ذلیل و خوار ہونا ہوگا اور یا تلوار کے گھاٹ اترنا ہوگا۔

اپنے حاکم کو بتادو کہ حسینؑ کہتا ہے کہ ذلت میرے لیے ناقابل برداشت چیز ہے۔ (هَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ)

کیا وہ سمجھتا ہے کہ میں بھی اسی کی طرح ہوں اور اسی

کے ماں باپ جیسے ماں باپ کی گود میں پل کر بڑا ہوا ہوں؟

يَأْبَى اللّٰهُ ذٰلِكَ لَنَا وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَحُجُوْرٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ۔

خدا چاہتا ہے حسینؑ ذلت گوارا نہ کرے۔ آخر میں کس کی گود میں پروان چڑھا ہوں؟ کیا اس حرام زادے کو علم نہیں کہ میں نے علی مرتضیٰؑ کی آغوش میں پرورش پائی ہے اور میں نے بنتِ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کا دودھ پیا ہے؟

پھر امامؑ نے سوال کیا:

وَحُجُوْرٌ طَابَتْ وَطَهُرَتْ:

کیا ایک ایسا شخص جس نے فاطمہ زہراؑ کا دودھ پیا ہو ابنِ زیاد جیسے مردود شخص کا قیدی بننے کی ذلت برداشت کر سکتا ہے؟

هَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ کہنے سے امام علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ کہاں ہم اور کہاں ذلت اور خواری پر رضامند ہونا؟

عاشورا کے دن امام حسینؑ کے شعار کی کیفیت کچھ یوں تھی جیسے کہ بیان کی گئی۔

ایک مشہور جملہ امام حسین علیہ السلام سے منسوب کیا جاتا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"مجھے ایک گھونٹ پانی دو"

میں (مصنف) نے ایسا کوئی جملہ نہیں دیکھا۔ فقط ایک ہی جگہ کہا گیا ہے کہ جب آپ حملہ کر رہے تھے تو آپ پانی طلب کر رہے تھے (وَهُوَ يَطْلُبُ الْمَاءَ)

قرآن سے پتا چلتا ہے کہ ان الفاظ سے مراد یہ ہے کہ آپ پانی کی جستجو میں تھے نہ یہ کہ آپ لوگوں سے پانی مانگ رہے تھے۔

امام حسینؑ کی عظمت اور چیز ہے اور ہم اور چیز ہیں۔ نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کے دوران کچھ شعار دیے جاتے ہیں۔ (نوحہ بے حد اچھی چیز ہے۔ ائمہ اطہارؑ شاعروں اور نوحہ خوانوں کو بلوا بھیجتے تھے تاکہ وہ مصائب بیان کریں۔ وہ لوگ مرثیہ پڑھتے تھے اور ائمہ اطہارؑ آنسو بہاتے تھے) ان حدود میں 'میں (مصنف) نوحہ خوانی، سینہ کوبی اور زنجیر زنی سب سے متفق ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ جو شعار ہوں وہ لوگوں کے خود ساختہ نہ ہوں بلکہ حسینی شعار ہوں مثلاً " نوجوان اکبر من نوجوان اصغر من " حسینی شعار نہیں ہے حسینی شعار کی نوعیت کچھ یوں ہوتی ہے:

حسینی شعار

امام حسینؑ نے بہ آواز بلند فرمایا:

أَلَا تَرَوْنَ إِلَى الْحَقِّ لَا يُعْمَلُ بِهِ وَ إِلَى الْبَاطِلِ لَا يُتَنَاهَى عَنْهُ لِيَرْغَبَ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ رَبِّهِ حَقّاً حَقّاً۔

اے لوگو! کیا تمھاری آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا؟ کیا تمھاری آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کون شخص باطل سے باز نہیں آ رہا؟ ان حالات میں یہ مناسب ہے کہ مومن اپنے پروردگار کے دیدار کو ایسی زندگی

پر ترجیح دے۔ (یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آپ نے حسین یا امام نہیں کہا بلکہ مومن کہا)۔

فَاِنِّیْ لَا اَرَی الْمَوْتَ اِلَّا سَعَادَةً وَّ الْحَیٰوةَ مَعَ الظَّالِمِیْنَ اِلَّا بَرَمًا۔

"میں موت کو خوش نصیبی کے علاوہ اور کچھ نہیں پاتا اور میری نگاہ میں ظالموں کے ساتھ زندگی گزارنا رنج اور بدنصیبی کے علاوہ اور کچھ نہیں"

امام عالی مقامؑ نے مزید فرمایا:

"میں عام لوگوں کی مانند نہیں ہوں کہ میرا قیام اور میرا انقلاب اس مقصد سے ہو کہ میں خود کوئی فائدہ حاصل کر سکوں یا مال و دولت جمع کر لوں یا سلطنت قائم کر لوں۔ آج سے دنیا کے لوگوں کو یہ بات جان لینی چاہیے"

ان میں سے ہر جملہ آبِ زر سے لکھنے اور ساری دنیا میں مشتہر کرنے کے قابل ہے تاکہ دنیا آپ کی تحریک کی حقیقت سے واقف ہو جائے۔

جس وقت امام حسینؑ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے تو انھوں نے اپنے بھائی محمد بن حنفیہؓ کے نام ایک وصیت نامہ لکھا جو ابن طاؤس نے نقل کیا ہے اس میں امام علیہ السلام نے اپنے قیام کا محرک بیان کر کے اپنی حکمتِ عملی واضح کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّ لَا بَطِرًا وَّلَا مُفْسِدًا وَّ لَا ظَالِمًا وَ اِنَّمَا خَرَجْتُ

لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ اُرِیْدُ

اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَنْھٰی عَنِ الْمُنْکَرِ

وَ اَسِیْرَ بِسِیْرَۃِ جَدِّیْ وَ اَبِیْ.

یعنی میں سرکشی اور جنگ و جدل کے ارادے سے نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد فساد پھیلانا یا کسی پر ظلم کرنا ہے۔ میں تو اپنے نانا کی اُمّت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔ میری غرض فقط امر بالمعروف نہی عن المنکر اور اپنے آب و جد کی پیروی ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ائمۂ اطہارؑ نے امام حسینؑ کی عزاداری کے سلسلے میں اتنا اہتمام کیوں کیا ہے اور یہ عمل کیوں اجر و ثواب کا موجب ہے۔ کیا یہ احکام اس لیے دیے گئے ہیں کہ چند مصیبت زدہ لوگوں سے ہمدردی کا اظہار کیا جائے جیسا کہ عام عزاداری میں ہوتا ہے مثلاً جیسے ہمارے ماں باپ مر جائیں تو لوگ تعزیت کرتے ہیں اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ نہیں قطعاً نہیں۔ ہماری اموات کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ ان میں کوئی فلسفہ، کوئی نصب العین اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ ائمۂ اطہارؑ نے یہ احکام اس لیے دیے ہیں تاکہ تحریکِ عاشورا اور یہ مکتب زندہ رہے تاکہ ہر سال جب نیا سال شروع ہو تو گو امام حسین ابن علیؑ بنفسِ نفیس موجود نہ ہوں لیکن وہ ایک علامت کے طور پر اور ایک قوت کی شکل میں زندہ ہوں تاکہ ہم ان سے الہام حاصل کرتے ہوئے مظلوموں اور مستضعفینِ جہان کی حمایت کریں اور طاغوتی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوں تاکہ دینِ اسلام کی حقیقی صورت برقرار رہے۔

محرم کا آغاز

امام حسینؑ اگرچہ فی زمانہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن جونہی محرم کا مہینہ شروع ہوتا ہے اچانک لوگوں کو یہ الفاظ سُنائی دیتے ہیں۔

اَلَا تَرَوْنَ اِنَّ الْحَقَّ لَا یُعْمَلُ بِہٖ وَ
اِنَّ الْبَاطِلَ لَا یُتَنَاھیٰ عَنْہُ لِیَرْغَبَ
الْمُؤْمِنُ فِیْ لِقَاءِ اللّٰہِ حَقًّا۔

اے لوگو! کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہو رہا اور گمراہی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ حالت ایسی ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ مومن اللہ سے ملاقات کا خواہاں ہے۔

اور وہ اس لیے تاکہ سچائی اور حقیقت کی بدولت اہلِ تشیّع کے دلوں میں زندگی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، مسلمانوں کے مابین صلح صفائی کرانے اور مسلمانوں کے امور میں خرابیوں کی اصلاح کرنے کا جوش اور جذبہ پیدا ہو پس اگر ہم سے پوچھا جائے کہ عاشورا کیا ہے تو ہمیں کیا جواب دینا چاہیے؟

ہمیں کہنا چاہیے کہ عاشورا ہماری زندگی کی تجدید کا دن ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہم ہر روز حسینی درسگاہ و مجلس عزا میں حاضری دیں اور اس کی پاک تعلیمات سے اپنے دل و دماغ کو روشن کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسلام کے اصول نئے سرے سے سیکھیں اور اس کے بنیادی عناصر کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور انھیں بھلا نہ بیٹھیں۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری روح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حس اور شہادت جہاد اور سرفروشی کے جذبات سے عاری ہو جائے

اور نہ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کریں اور پھر امام حسینؑ کا نام لے کر انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ ہمارے گناہ اسی وقت بخشے جاسکتے ہیں جب ہماری رُوح امام حسینؑ کی رُوح سے مربوط ہوجائے۔ جب ہم حسینی بن جائیں گے اور امام حسینؑ کے نُور کی شعاعیں ہماری رُوح پر منعکس ہوں گی تب ہم گناہ کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گے۔

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا شعار

یہی وجہ تھی کہ حضرت سیّد الشہداء نے امیر معاویہ کی زندگی کے آخری سالوں میں بلادِ اسلامی میں منتشر صحابہ اور ان کی اولاد کو خطوط لکھکر دعوت دی تھی۔ کم و بیش ایک ہزار صحابہ اور تابعین منیٰ میں جمع ہوئے تھے۔ آپؑ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> "تم دیکھ رہے ہو کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے حامیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تمھیں لازم ہے کہ اس مجلس میں جو گفتگو ہو اُسے واپس جاکر اپنے ہم وطنوں سے بیان کرو۔"

اس کے بعد آپ نے اپنے والدِ بزرگوار کے فضائل و مناقب ایک ایک کرکے بیان کیے اور لوگوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کی۔

تحف العقول میں جو خطبہ درج ہے اُس کے فقروں کے دروبست اور طرزِ خطاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسی موقع کا ہے اور یہیں سے انقلاب کی تخم ریزی شروع ہوئی تھی۔ بات کو واضح کرنے کے لیے ہم اس خطبے کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں۔ امام عالی مقامؑ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں آیاتِ الٰہی سُنا کر کہا:

"صاحبو! تم علم، بھلائی اور خیر خواہی کے لیے مشہور ہو۔ لوگوں کے دلوں میں تمھاری عظمت ہے۔ شریف تمھارا احترام کرتے ہیں اور کمزور تمھاری عزّت کرتے ہیں۔ وہ بھی جن پر تمھارا کوئی احسان نہیں تمھیں اپنے سے بہتر اور برتر سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد آپؓ نے فرمایا:

"تم اللہ سے بھلائی کے مستحق ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ کہیں غضب الٰہی میں گرفتار نہ ہو جاؤ کیونکہ تم خدا کے فضل سے ایسے درجہ پر ہو جو دوسروں کو حاصل نہیں۔ تمھاری لوگوں میں عزّت ہے لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ خدا سے کیے ہوئے وعدے توڑے جا رہے ہیں مگر تمھیں گھبراہٹ نہیں ہوتی حالانکہ تمھارے آبا سے کیے ہوئے وعدوں کی اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو تم بے چین ہو جاتے ہو۔ رسول اللہؐ کی امانت کو کوئی پوچھتا نہیں۔ بستیوں میں اندھے، گونگے اور اپاہج پڑے پھرتے ہیں جن پر کوئی ترس نہیں کھاتا تم اپنی ذمّے داریوں کی پرواہ نہیں کرتے اور جو ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں اُن کی طرف تم کوئی توجہ نہیں کرتے۔ ظلم کو نظر انداز کرکے اور ظالموں سے تعاون کرکے اپنے بچاؤ کی فکر کرتے ہو۔ ان ہی باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے اور

دوسروں کو بھی منع کرنے کے لیے کہا ہے لیکن تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔ سب سے زیادہ مصیبت تو تمھاری ہی ہے کیونکہ جو مرتبہ تمھیں ملنا چاہیے تھا اور جو علمار کا حق تھا تم اس سے زبردستی محروم کر دیے گئے ہو۔ کاش تم سمجھتے (کوشش کرتے)۔"

پھر حضرت نے فرمایا:

"دراصل انتظام و انصرام اور اجرائے احکام کا کام علمار کے ہاتھ میں ہونا چاہیے تھا جو حلال و حرام سے واقف اور اللہ کی طرف سے ان کاموں کے نگراں ہیں مگر تم سے تمھارا مرتبہ چھین لیا گیا اور یہ اس لیے ہوا کہ تم حق سے دُور ہو گئے اور واضح دلائل کے باوجود سنّت کے بارے میں تم میں اتفاق نہیں۔ اگر تم اپنی ذمّے داری محسوس کرتے اور تکلیف برداشت کرتے تو سب اختیارات تمھارے ہی ہاتھ میں ہوتے لیکن تم نے اپنی جگہ ظالموں کو دے دی اور سب اختیار انھیں سونپ دیا جو مشتبہ طریقوں پر چلتے اور اپنی بے ہودہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اس لیے تم پر مسلط ہو گئے کہ تم موت سے بھاگتے تھے اور تمھیں زندگی عزیز تھی جو بہرحال فانی ہے۔ تم نے کمزوروں کو ان کے ہاتھ میں دے دیا تو کچھ بے چارے غلام بن کر پس گئے اور کچھ نانِ جویں کو محتاج ہو گئے اب وہ سارے ملک میں

سن مانی کرتے ہیں اور اپنی خواہشات پر چل کر رسوائی سمیٹتے ہیں، بُرے لوگوں کے طریقے اپناتے ہیں اور خدا کی پرواہ نہیں کرتے۔ ہر بستی میں منبر پر اُن کا خطیب چیختا ہے۔ وہ خدا کی زمین کے بلا شرکتِ غیرے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کوئی اُن کا ہاتھ روکنے والا نہیں اور سب لوگ اُن کے زیر دست ہیں۔ وہ جس پر چاہیں ہاتھ ڈالیں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ کچھ سرکش ہٹ دھرم اور غریب آزار ہیں، کچھ خدا و یومِ آخرت سے بیگانہ! کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ ملک ایسے ظالموں کے ہاتھوں میں ہے جن کا کام صرف لوٹ کھسوٹ ہے اور ایسے لوگ حاکم بنے بیٹھے ہیں جنھیں مومنوں پر رحم نہیں آتا ....."

امام حسینؑ کے شعار اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے شعار ہیں اور وہ یہ ہیں:

"مسلمانوں کے بیت المال پر چند لوگوں نے کیوں قبضہ جما رکھا ہے؟"

"خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کیوں قرار دیا جا رہا ہے؟"

"لوگوں کو دو حصوں میں کیوں تقسیم کر دیا گیا ہے؟"

"عوام الناس غربت میں مبتلا ہیں اور چند لوگ کھا کھا کر اتنے فربہ ہو گئے ہیں کہ اپنی جگہ سے اُٹھ بھی نہیں سکتے!"

امام حسینؑ نے حُرؓ کے لشکر کو خطبہ دیا اور رسولِ اکرمؐ کی حدیث نقل کی۔
آپؑ نے فرمایا:

"اگر ایسا زمانہ آجائے جب مسلمانوں کے بیت المال کی یہ حالت ہو اور خدا کے حلال اور حرام کی یوں تعبیر کی جائے اور حالات ایسے ہوں (جیسے کہ ہو چکے ہیں) تو رسولِ اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ: اگر ایک باشعور مسلمان ان حالات سے واقف ہو اور خاموش رہے تو خدا کے لیے جائز ہے کہ ایسے مسلمان کو وہیں لے جائے جہاں وہ ان ظالموں کو لے جاتا ہے۔ لہٰذا مجھے جواب دہی کا احساس ہے اور ان حالات میں مَیں سب سے زیادہ ذمے دار ہوں۔"

پس یہ ہے عاشورا۔ یہ ہے اس کا مکتب اور یہ ہیں اس کے شعار۔

ہمیں چاہیے کہ ہم مجالس اور اجتماعات میں وہ شعار دیں جو بے حس کرنے والے نہ ہوں بلکہ حیات بخش ہوں۔ اگر وہ بے حس کرنے والے ہوں گے تو فقط یہی نہیں کہ ہمیں ان کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا بلکہ وہ ہمیں امام حسینؑ سے دُور کر دیں گے امام حسینؑ کی خاطر آنسو بہانا بڑے ثواب کا موجب ہے لیکن شرط یہ ہے کہ امام حسینؑ ہمارے دلوں میں اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوں۔

اگر کسی دل میں ایمان ہو تو یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اس میں امام حسینؑ کے لیے محبت نہ ہو کیونکہ امام حسینؑ ایمان کا مجسّم ہیں۔

اِنَّ لِلْحُسَيْنِ مَحَبَّةً مَكْنُونَةً فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ۔

جب امام حسینؑ میدانِ جنگ میں تنہا کھڑے تھے تو بڑے بلند شعار دے رہے تھے اور بڑے طولانی اشعار پڑھ رہے تھے۔

